جون 2007

قیمت : -/10 روپے

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

قومی اردو کونسل اور کیندریہ ہندی سنستھان دلی کیندر کے اشتراک سے ایک سہ روزہ سیمینار 8/مئی سے 10/مئی 2007 تک "1857: نشاۃ الثانیہ اور ہندوستانی زبانیں" ساہتیہ اکادمی آڈیٹوریم، نئی دہلی میں منعقد کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاح مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے فرمایا۔

سیمینار کے پہلے اجلاس (9/مئی) میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید خوشگوار موڈ میں اجلاس کے صدر پروفیسر اقتدار عالم خاں سے محوِ گفتگو۔ ساتھ میں تشریف فرما ہیں مہمان خصوصی پروفیسر عرفان حبیب اور پروفیسر اصغر عباس۔

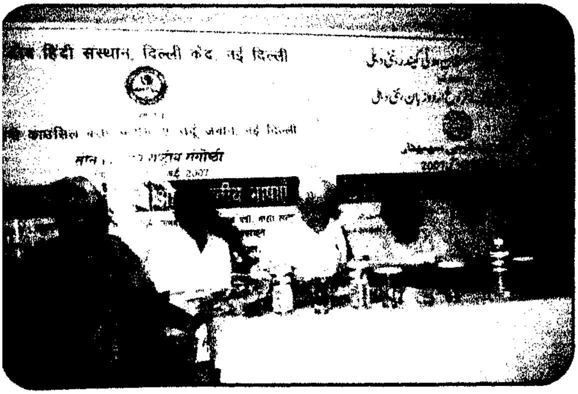

پہلے اجلاس کے شرکا (دائیں سے) پروفیسر اقبال حسین، مہمان خصوصی پروفیسر عرفان حبیب، اجلاس کے صدر، پروفیسر اقتدار عالم خاں، جناب رمیش راوت اور ناظم اجلاس مخمور سعیدی۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔9، شمارہ۔6 جون 2007

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

معاون مدیر: ڈاکٹر رئیس احمد

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلی تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔ 88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:

ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ-6

آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی- 066 110

فون: 26103938، 26103381

فیکس: 26179657، 26108159

ویب سائٹ:

http://www.urducouncil.r.ic.in

email: ncpuleditorial@yahoo.co.in

urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،

آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی۔ 110066

فون: 26169416، 26109746

شاخ: 110-7-22 محلہ قطور، ساجد یار جنگ کمپلکس،

بلاک نمبر 5-1، چھتر گلی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات .... ادارہ 7

زبان، تعلیم اور ادب

● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف .... شمس الرحمن فاروقی 8

● ریاست کیرالا میں اردو درس و تدریس کے مسائل .... محی الدین کٹی 11

● ریاست جموں و کشمیر میں اردو تعلیم .... الطاف انجم 14

● اتر پردیش میں اردو بحیثیت سرکاری زبان .... محمد عبدالقدیر 16

● اسکول لائبریری .... محمد حسن فاروقی 19

● ادب اطفال نئی ضرورتیں، نئے تقاضے .... اظہار اثر 22

● اردو مشاعروں کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت .... مرضیہ عارف 24

● درد آشنا .... رفعت کاظمی 26

مجاہدین آزادی

● مولوی علاء الدین .... سید داؤد اشرف 28

● طرہ باز خاں .... سید امتیاز الدین 31

● شہزادہ فیروز شاہ .... لطیف حسین ادیب 33

● مولوی لیاقت علی .... لئیق رضوی 35

ماحولیات

● ماحولیاتی تحفظ .... محمد محمود فیض آبادی 37

شخصیت

● ستیش گجرال .... بابر شریف 38

کیریئر

● ریڈیو نشریات اور اردو .... حسن مثنیٰ 40

روبرو

● پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے ایک مختصر گفتگو .... مناظر عاشق ہرگانوی 42

ہماری مطبوعات

● نشاۃ ثانیہ اور اردو .... سید احتشام حسین 44

اردو خبرنامہ .... ادارہ 59

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 71

بچوں کا گوشہ

● پولیا .... میخائل زوشینکو 79

آپ کی بات

■ راحت الماس، کاشانۂ شفیق، نزد کمہار اکنواں، ملارنا ڈونگر،
سوائی مادھوپور، راجستھان-322028

ماہنامہ'' اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ مئی 2007 باصرہ نواز ہوا۔ شکریہ 'تعارف' کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید کی شخصیت سے متعارف ہونے کا موقع ملا، امید کی جاتی ہے کہ قومی اردو کونسل نئے ڈائرکٹر کی سرپرستی میں بطور خاص اردو زبان اور تعلیم کے تعلق سے نمایاں کام انجام دے گی۔ خاکسار کی جانب سے ڈائرکٹر صاحب کو اس منصب اعلیٰ کے لیے بہت بہت مبارکباد۔

'زبان اور تعلیم' کے حوالے سے آپ کے جریدے کا مستقل کالم 'اچھی اردو: روزمرّہ، محاورہ، صرف' از جناب شمس الرحمٰن فاروقی طلبہ، اسکالرز اور اساتذہ کے لیے یکساں طور پر مفید مطلب ثابت ہورہا ہے جس کے لیے جناب شمس الرحمٰن فاروقی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس گوشے کے دیگر مضامین میں 'املا اور تلفظ کے کچھ مسائل' از سالکہ خاتون صدیقی 'اردو زبان کی تعلیم اور علاقائی زبانیں' از کلیم ضیا اور 'مدارس کی جدید کاری' از ڈاکٹر محمد جہانگیر وارثی اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے مکمل اور جامع ہیں۔

'گوشۂ ادب' میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' پر ڈاکٹر احمد محفوظ کا سیر حاصل مقالہ شامل ہے ڈاکٹر احمد محفوظ نے بڑی توجہ اور محنت سے لکھا ہے۔ 'یونان کا کلاسیکی ڈراما' جناب غلام نبی خیال کا نہایت معلوماتی مضمون ہے۔ ڈاکٹر ابوالکلام نے 'افسانوی ادب کا ترجمہ' کے موضوع پر اچھی گفتگو کی ہے۔ عابد سورتی کی گجراتی کہانی نے بہت متاثر کیا، اس کہانی کے مترجم ڈاکٹر خورشید عالم اس سلیس اردو ترجمے کے لیے قابل مبارکباد ہیں۔

مختلف موضوعات کے تحت دیگر قابل ذکر مضامین میں 'آثار فیض آباد' (تنویر سلطانہ) 'مزدور بچے' (فروغ صباجامی) 'ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر' (افتخار الزماں) 'ہم اور ہمارے بچے' (رضوان رضوی) اور 'درخواست نگاری کے رہنما اصول' (سید فضل اللہ مکرم) دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔ ایسے مختلف النوع مضامین کی شمولیت اور انتخاب کے لیے آپ کا حسن انتخاب اور حسن ادارت لائق تحسین ہے۔

'اردو خبرنامہ' ادبی سرگرمیوں کا جامع مرقع پیش کرتا ہے۔ 'تبصرہ و تعارف' کے تحت بحیثیت مبصر جناب مخمور سعیدی، عبدالرب، احمد کفیل، مشتاق احمد، شاذیہ عمیر اور رئیس احمد نے تبصرے کا حق ادا کیا ہے۔ بچوں کے گوشے کے تحت محمد فضل خاں نے حضرت امیر خسرو کی چند پہیلیاں پیش کی ہیں جو بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔ رسالے کا سرورق 'کثرت میں وحدت' کا عکاس ہے۔

■ ڈاکٹر سید علی حیدر رضوی، 221- پریتم نگر، سلیم سرائے،
الٰہ آباد-211001

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے منصب پر ڈاکٹر علی جاوید کا تقرر اردو کے حق میں ایک نیک شگون ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید کا آبائی وطن الٰہ آباد کا مشہور و معروف قصبہ کراری ہے جو اپنی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کی بنا پر بقول ڈاکٹر اعجاز حسین: ''الٰہ آباد میں لکھنؤ کا نمونہ سمجھا جاتا تھا...... یہاں علم و ادب کا غیر معمولی چرچا تھا'' (میری دنیا۔ ص-387)

پیدائش البتہ ان کی کراری سے ملحق، کچی دیواروں اور پھوس کے چھپر کے مکانات والے چھوٹے سے غیر معروف گاؤں ایدلپور میں نانا کے گھر ہوئی جہاں کسانوں کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں کے درمیان چار گھر متوسط طبقے کے مسلمانوں کے بھی تھے جن کے پاس اس وقت تک صرف چند بھولی بسری یادیں رہ گئی تھیں۔ ہر زمانے میں مردم خیزی اس اجڑے دیار کا خاصہ رہی جو ایک بڑے جھیل نما تالاب کے دامن میں آباد ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اشوک اعظم کے عہد میں یہ کوئی چھاؤنی یا سرائے جیسا مقام تھا۔ تالاب سے کھدائی کے دوران نکلی چار چار فٹ کی اینٹیں اس کی گواہی دیتی ہیں۔

اس چھوٹے سے گاؤں ایدلپور میں زندگی کے کچھ دن گزار کر علی جاوید والد کے گھر کراری چلے آئے۔ پھر بی. اے. کرنے کے لیے الٰہ آباد یونی ورسٹی میں داخل ہوئے بی. اے. کرنے کے بعد دہلی کا رخ کیا اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جے این یو سے دہلی کالج پہنچے جہاں درس کے ساتھ تدریس بھی ہاتھ آئی۔ اسی درمیان ان کا پہلا تحقیقی کارنامہ ''اردو کا پہلا باغی شاعر' جعفر زٹلی'' سامنے آیا۔

اردو دنیا میں ایک انتہائی فعال اور کمیٹڈ ترقی پسند فکر و عمل کے انسان کی حیثیت سے ڈاکٹر علی جاوید نے اپنی شبیہہ بنائی اور خوف و خطر کو خاطر میں نہ لانے والے اپنے باغیانہ رویّے سے پہچانے گئے۔ جن لوگوں نے 1980 میں اس سیمینار میں شرکت کی ہوگی جس میں قاضی عبدالستار اردو شاعری اور اردو غزل کو ہدف ملامت بنارہے تھے، انھیں وہ نوعمر لڑکا یاد ہوگا جس نے اسٹیج پر جاکر بے باکانہ انداز میں اپنی ادبی اور تہذیبی روایت کے دفاع میں قاضی صاحب سے اختلاف کیا تھا۔ یہ بے خوفی ان کے کردار کا جز بنی رہی ہے اور ادب کا وہ ماحول جو انسان کو زندگی کی قدروں سے گریزاں ہونا نہیں سکھاتا بلکہ مستحکم جدلیاتی شعور عطا کرتا ہے یہ شعور انھیں اپنے والد شباب صاحب سے بھی ملا اور ایدلپور سے بھی جس کو دیکھتے ہی ''لمہی'' کی یاد آتی ہے۔ میں ذاتی طور پر جانتا

ہوں کہ ڈاکٹر علی جاوید نے ہمیشہ اپنی زندگی کا ایک ہی اصول رکھا کہ آدمی ہر طرح کے احساسات کی یورش سے بچتے ہوئے کسی جھجک کے بغیر مقصد و اصول کے تحت زندگی گزارے۔ بعض دانشوروں کی طرح انھوں نے نہ اپنی زندگی پر تصنع کا رنگ چڑھایا نہ پروفیسرانہ انداز میں علمی تکبر کو اپنے پاس آنے دیا۔ لوگ بڑا آدمی بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر علی جاوید نے ہندوستان کا عام آدمی بننے کی کوشش کی۔ ان کا لہجہ، طرز گفتگو، طرز عمل، سب میں آپ کو اپنائیت محسوس ہوگی۔ انھوں نے کبھی کسی کو مرعوب نہیں کرنا چاہا بلکہ محبوب کرنا چاہا اور اسی لیے ان کو کتنی ہی بڑی کرسی پر بیٹھا دیا جائے وہ کرسی چھوٹی معلوم ہوگی۔

ایسے ہی لوگ ہیں جو حقیقی معنوں میں کل کے ہندوستان کا مقدر کہے جاسکتے ہیں اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان اردو زبان کے روشن مستقبل کے ضامن بھی۔ الہٰ آباد کے تمام اردو دوست اس تقرر پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔

■ **پشپندر کلشریشٹھ، سکریٹری جنرل، پریس کلب آف انڈیا، 1، رائے سینا روڈ، نئی دہلی-110001**

پریس کلب آف انڈیا کی طرف سے میں آپ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالنے پر مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کی صلاحیت اور تجربے سے اردو کونسل بھرپور فائدہ اٹھائے گی۔

■ **شہزادہ انجم، روز اپارٹمنٹ، ڈی-5 فرسٹ فلور، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025**

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر بننے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی قیادت و رہنمائی میں کونسل کی یقیناً ترقی ہوگی۔ 9 اپریل 2007 کو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں فراق میموریل لکچر کے موقعے پر آپ کا استقبال کرنے کے بعد میں مبارکباد پیش کر چکا تھا لیکن "اردو دنیا" میں آپ کی تصویر دیکھ کر اور اجمالی تعارف پڑھ کر جی چاہا کہ ایک بار پھر مبارکباد پیش کروں۔ انشاء اللہ میرا بھرپور تعاون آپ کو حاصل رہے گا۔ میری جب بھی ضرورت ہو آپ یاد کرسکتے ہیں۔ آپ میرے بھائی جان (ڈاکٹر محمد ظفر الدین، حیدرآباد) کے استاد بھی رہ چکے ہیں۔ اس کا مجھے ہمیشہ خیال و لحاظ رہا ہے۔ بہت بہت مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **ضیاء الرحمٰن غوثی، کے-94 (جی۔ ایف۔) ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-110025**

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ڈائرکٹر بننے پر میری دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ آپ کی فعالیت یقینی طور پر اردو کے کاز کو تقویت پہنچائے گی۔

■ **اخلاق اثر، صادق منزل، جوکی امام باڑہ، بھوپال-452001**

بڑی خوشی کی بات ہے کہ "اردو دنیا" باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ "ہماری بات" بھی بامعنی ہے۔ شہید صحافیوں کو "خلوص دل سے خراج عقیدت" پیش کرنے کے جذبے کی قدر کرتا ہوں اور مشورہ دیتا ہوں کہ سال بھر "اردو دنیا" کے سرورق پر ان کی تصویریں شائع کی جائیں۔ 21 اپریل کو اقبال کا یوم وفات ہے۔ ان کی تصویر یا ان پر کوئی مضمون یا اداریے میں اس کا ذکر ضروری تھا کہیں آپ بھی تو ان کو زندگی بھر پاکستان کی وکالت کرنے والا اور پاکستان جا کر مرنے والا تو نہیں سمجھتے۔ (1)

چندر بھان خیال "ساری دھرتی ایک خاندان" کے ہندوستانی نعرے کی بات تو کرتے ہیں لیکن یکم جنوری 1938 کے نئے سال کے اقبال کے پیغام "ساری دنیا خداوند تعالیٰ کا ایک واحد خاندان ہے۔" کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

"تمس" میں گووند نہلانی نے سورہ "الکافرون" شامل کر کے اسلام کے حال اور ماضی کو جوڑ دیا اور اس طرح کہ اس میں ایک اعلیٰ فن پارے کی شان پیدا کر دی۔ "کتنے پاکستان" صحافت ہے ادب نہیں۔ شبلی نعمانی کے بارے میں جو کچھ کملیشور نے لکھا ہے "اردو دنیا" میں اشاعت سے قبل آپ کو تصدیق کر لینی چاہیے تھی، اور مدیر کو نوٹ دینا چاہیے تھا۔ وہ شبلی ہوں یا کوئی اور قابل اعتراض بات پر پکڑ ضرور کرنی چاہیے۔

■ **جے۔ ایم۔ مہتا، جے-186، ساکیت، نئی دہلی-110017**

سب سے پہلے ڈائرکٹر کا چارج لینے پر میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ماہ مئی کے شمارے میں دیے گئے آپ کے تعارف سے ظاہر ہے کہ آپ "اردو دنیا" میں چھپنے والے تمام مشمولات کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں گے۔ اس شمارے کے بھی مضامین کارآمد اور دلچسپ لگے۔ لیکن خاص طور پر عابد سورتی کی گجراتی کہانی "نابینا" کا اردو ترجمہ بہت اچھا لگا۔ کہانی تو بلاشک نہایت عمدہ اور دل کو چھونے والی تھی ہی لیکن اس کا اردو ترجمہ عام فہم اور سلیس اردو میں ہونے کی وجہ سے قابلِ تعریف ہے۔ کہانی کار عابد سورتی اور "اردو دنیا" کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔

آپ کے رسالے میں ایک "بچوں کا گوشہ" بھی ہے۔ جو بچوں کے لیے کارآمد اور دلچسپ ہوگا۔ میری ایک چھوٹی سی تجویز ہے کہ آپ ایک ایسا ہی "بزرگوں کا خانہ" بھی "اردو دنیا" میں ضرور شامل کریں۔ تاکہ میرے جیسے بزرگ لوگ بھی اس کا فائدہ اٹھاسکیں۔

■ **محمد عمران، 521 / شیخ سرائے، پرانا سیتاپور (یوپی)**

"اردو دنیا" اپریل 2007 کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے کے تمام مضامین کارآمد اور قابلِ تحسین ہیں۔ "اچھی اردو، روزمرہ، محاورہ، صرف"،

(1) ہم اگر ایسا سمجھتے تو اقبال کے دونوں کلیات (اردو اور فارسی) کی اشاعت کا اہتمام نہ کرتے۔ (ادارہ)

"اعلیٰ تعلیم اور کثیر ثقافتی معاشرہ" اور "عالمی بازار اور ہندوستان میں تعلیم" کے علاوہ دیگر مضامین بھی بہت خوب ہیں۔ "اردو دنیا" اردو رسالوں میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ جس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

■ **تابش مایاپوری، ہندپیڑھی، جی ٹی روڈ، رانچی، جھارکھنڈ**

اپریل 2007 کا شمارہ ملا۔ مارچ کے شمارے کا اداریہ پڑھ کر دل لرز گیا تھا۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے "آج ہمارا سماج متعدد خرابیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ دوسروں کو برداشت کرنے اور ایک دوسرے کا لحاظ کرنے کی خصلت مفقود ہوگئی ہے۔" پورا اداریہ ایک اسپرٹ لیے ہوئے ہے۔ اس اسپرٹ کو قوم کے سارے نوجوانوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں آج کا ہر فرد جو صاحب اولاد ہے اس کرب میں مبتلا ہے میں اسے بار بار پڑھتا ہوں اور ملنے والوں کو اس سے آگاہ کرتا ہوں۔ دیگر مضامین بھی پسند آئے۔ بچوں کا گوشہ اس قدر مقبول ہو رہا ہے کہ میں جب رسالہ لاتا ہوں تو میری بچیاں بچوں کا گوشہ پڑھ لیتی ہیں تب مجھے پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ اپریل کا شمارہ ابھی ان لوگوں کے مطالعے میں ہے۔ کافی پسند کی نگاہوں سے رسالہ دیکھا جارہا ہے۔ یہ سب آپ لوگوں کی محنت کا ثمرہ ہے۔

■ **زبیر احمد بھاگلپوری، اردو شعبہ بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ-15**

"اردو دنیا" پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ "زبان و تعلیم" کے تحت مستقل کالم "اچھی اردو روزمرّہ، محاورہ، صرف" از جناب شمس الرحمٰن فاروقی یقینی طور پر "اردو دنیا" کی مقبولیت میں اضافہ کررہا ہے۔ اپریل کے شمارے میں محمد سراج الدین کا مقالہ بعنوان "انگریزی زبان پر عربی کا اثر" بھی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

ان دنوں میں دیکھ رہا ہوں "اردو دنیا" میں علم کی ہر شاخ سے تمتع حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ آپ کا یہ جذبہ یقیناً قابل قدر ہے لیکن کسی بھی مقالے کی اشاعت سے پہلے قارئین کی دلچسپی اور عوامی زندگی میں اس کی افادیت کو لازمی طور سے مدنظر رکھا جائے۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ کیریر کے کالم کے تحت پھر سے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔

■ **جمیل عشرت، آر.بی.منزل، جہانگیری محلہ، آسنسول-713302**

ماہنامہ "اردو دنیا" دیگر رسالوں سے منفرد ہے اور اپنی علاحدہ شناخت رکھتا ہے۔ منظومات غضب کے ہوتے ہیں۔ "اردو خبرنامہ" پڑھ کر دل خوش ہوجاتا ہے۔ ہمارے ملک کے مختلف گوشوں میں اردو کے قابل ذکر پروگرام آئے دن منعقد ہوتے رہتے ہیں، اس سے فروغ اردو کا پتا چلتا ہے۔

■ **قمر بانو کریم، سابق ڈائرکٹر پری آئی۔اے۔ایس کوچنگ سینٹر، انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، ناگپور (مہاراشٹر)**

ناگپور میں اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول اور جونیئر کالج تو بہت ہیں، ان میں زیر تعلیم طلبہ و طالبات کی تعداد بھی اچھی خاصی رہتی ہے۔ تاہم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ میں مسلم طلبہ کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ مقابلہ جاتی امتحانات اس بات کے شاہد ہیں۔ سماجی تنظیموں اور سماجی رہنماؤں کو اس بارے میں سوچنا چاہیے کہ مسلم طلبہ اعلیٰ تعلیم کیوں حاصل نہیں کرتے؟ ساتھ ہی مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہیے۔

میرے خیال میں جب تک ہمارے طالب علم اپنی زندگی کے ایک مقصد کا تعین نہیں کر لیتے تب تک وہ تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے نہیں کر سکتے۔ اگر اردو ذریعۂ تعلیم سے وابستہ طلبہ و طالبات زندگی کے مقصد کا تعین کرلیں اور درج ذیل نکات پر عمل پیرا ہو جائیں تو وہ بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہو سکتے ہیں۔ وہ نکات یہ ہیں:

☆ ہر طالب علم میں حصول علم کی لگن ہونی چاہیے۔

☆ طالب علم اپنے کام کا آغاز صحیح طریقے سے کرے تو آگے کے مراحل بخوبی طے کر سکتا ہے۔

☆ طلبہ میں خود اعتمادی کا ہونا اشد ضروری ہے۔

☆ مستقل مزاجی کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔

☆ نامساعد حالات کا مقابلہ کر کے آگے بڑھنا چاہیے۔

☆ اپنے کام کو مقررہ وقت پر انجام دینے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

آج کا دور مقابلے کا دور ہے۔ اس دور میں اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لیے مقابلہ جاتی امتحانات دینا ضروری ہے۔ ان مقابلہ جاتی امتحانات کا اہتمام مختلف کمیشن کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن، یونین پبلک سروس کمیشن وغیرہ جن کے متعلق معلومات اخبارات کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ مقابلہ جاتی امتحانات اگرچہ انگریزی اور مراٹھی زبان میں ہوتے ہیں تاہم مسلم امیدواروں کو اس سلسلے میں یہ سہولت دی جاتی ہے کہ وہ سول سروس کے امتحانات اردو میڈیم کے ذریعے دے سکتے ہیں۔ اس سہولت سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرنے میں جو سب سے بڑی دشواری پیش آتی ہے وہ ہے اردو زبان میں کتابوں اور مواد کا نہ ہونا۔ اس مسئلے کے تدارک کے سلسلے میں درج ذیل اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

☆ اردو ذریعۂ تعلیم سے وابستہ طلبہ میں ہائی اسکول اور جونیئر کالج کی سطح پر انگریزی بولنے کی صلاحیت پیدا کرنے کا مخصوص انتظام کرنا چاہیے۔

☆ اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبہ میں جنرل نالج کے حصول کا رجحان بیدار کرنے کے اقدامات کرنے چاہئیں۔

☆ ہائی اسکول اور جونیئر کالج کی سطح پر ہی طلبہ کی مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور انھیں ذہنی طور پر تیار کرنا چاہیے۔

☆ اردو لائبریریوں کی مالی اعانت کی جانی چاہیے تاکہ جدید سائنٹفک طرز کی لائبریریاں اردو علاقوں میں قائم ہوسکیں۔ جن میں MPSC, UPSC

امتحانوں کی کتابوں کا سیٹ دستیاب ہو۔ ساتھ ہی مقابلہ جاتی امتحانوں سے تعلق رکھنے والے رسائل و جرائد بھی ان لائبریریوں میں ہونے چاہئیں۔

■ **محمد عبیداللہ، بھومری، پوسٹ بکس رگھوناتھ پور، کاشی پور، ضلع 24-پرگنہ، ویسٹ بنگال-743502**

میں حکومت مغربی بنگال کے ایک مدرسے کے شعبۂ اردو کا طالب علم ہوں۔ مدرسے کی لائبریری میں ''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ پڑھتا رہتا ہوں، یہ جریدہ بے حد معیاری ہے۔ گوشۂ ادب ہو یا تبصرۂ کتب مجھ جیسے طالب علم کے لیے اس کا مطالعہ بہت فائدہ رساں ہے۔

■ **محمد رضا، E-224، مہاندی ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی 110067**

مئی 2007 کا ''اردو دنیا'' موصول ہوا۔ اس کے مشمولات خوب سے خوب تر ہیں۔ ''ہماری بات'' کے تحت ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی (مئی 1857) پر بہت ہی معلوماتی اور فکر انگیز اداریہ تحریر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید سے تو ہم بھی واقف ہیں، لیکن کونسل کے ڈائرکٹر بن جانے کے بعد ہماری توقعات مزید بڑھ گئی ہیں۔ امید ہے، ان کی رہنمائی میں کونسل نہ صرف یہ کہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گی بلکہ اس سے بے روزگار اردوداں طبقے کو زیادہ سے زیادہ اور کل وقتی فائدہ پہنچے گا۔ آپ کے مستقل کالم ''اچھی اردو روزمرہ، محاورہ، صرف از شمس الرحمن فاروقی کا کیا کہنا، بے حد معلوماتی ہوتا ہے۔ اس سے ہماری معلومات میں ہر بار اضافہ ہوتا ہے اور ہماری اردو یقیناً اچھی ہوتی جارہی ہے۔ سالکہ خاتون صدیقی کا مضمون ''املا اور تلفظ کے مسائل''، کلیم ضیا کا مضمون ''اردو زبان کی تعلیم اور علاقائی زبانیں'' اور محمد جہانگیر وارثی کا مضمون ''مدارس کی جدید کاری'' زبان و تعلیم پر اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرآسماں'' پر ڈاکٹر احمد محفوظ کا مضمون یقیناً لائق تحسین ہے۔ یونان کے کلاسیکی ڈراموں پر غلام نبی نیال کا مضمون بے حد معلوماتی ہے۔ دیگر مشمولات میں تاریخ، سماجیات، شخصیت، تربیت اطفال اور درخواست نگاری پر اچھے مضامین ہیں جن سے ہماری معلومات میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے۔

دو جواب طلب خط

■ **سید علیم اشرف جائسی، شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باولی، حیدرآباد**

''اردو دنیا'' کا فروری 2007 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' بے حد دلچسپ، مفید اور معلومات افزا سلسلہ ہے جس کے لیے ہم لوگ محترم شمس الرحمن فاروقی صاحب اور ادارہ دونوں کے ممنون و متشکر ہیں۔

زیر نظر شمارے سے متعلق چند معروضات ہیں چونکہ ان میں سے بعض کا تعلق دینی اور تاریخی حقائق سے ہے لہٰذا ان کی وضاحت ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اس سلسلے کا تعلق تو تہذیب زبان سے ہے اس میں تو کتابت کی پیش آمدہ غلطی کی بھی نشاندہی ہونی چاہیے۔

1- دو صفحے میں چار الگ الگ جگہوں پر مضموم (ضمہ یا پیش والا حرف) کو مضمون لکھا گیا ہے۔

2- آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اولاد ذکور کے بارے میں راجح قول یہ ہے کہ آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ قاسم، عبداللہ اور ابراہیم، طیب و طاہر عبداللہ ہی کے القاب تھے۔ ایک کمزور روایت یہ ہے کہ بعثت سے قبل آپ کے دو صاحبزادوں کی ایک ساتھ ولادت ہوئی تھی جن کے نام طاہر و مطہر تھے۔ مضمون میں وارد لفظ ''مطاہر'' (الف کے ساتھ) تاریخی و لغوی دونوں اعتبار سے نادرست ہے۔

3- محترم فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ ''شرجیل، بروزن تفصیل (اول مفتوح، یائے معروف) بالکل صحیح اور اچھا مردانہ نام ہے۔ حضرت شرجیل بن حسنہ مشہور صحابی تھے۔۔۔ غالباً یہ بہت پرانا عرب نام ہے..... شُرجیل اس کی تصغیر معلوم ہوتا ہے۔'' جبکہ اس لفظ کا صحیح تلفظ ہے: شُرَحبیل (شین مضموم + راء مفتوح + حاء ساکن + باء مکسور) اور یہ عجمی معرب لفظ ہے۔ چونکہ اس لفظ میں جیم ہے ہی نہیں لہٰذا ''شرج'' سے اس کے اشتقاق کا احتمال بلکہ امکان ہی نہیں ہے۔

شُرجیل بن سعد بھی شرجیل بن سعد ہے، معروف محدث تھے۔ چونکہ ''شرحُبیل'' تصغیر کے معلوم اوزان کے مطابق نہیں لہٰذا یہ اسم تصغیر بھی نہیں ہوسکتا۔

شُرحبیل قرون ثلاثہ میں ایک مقبول نام تھا چنانچہ شرحبیل بن حسنہ کے علاوہ شرحبیل ابن غیلان، ابن السمط، ابن اوس اور اوس بن شرحبیل بھی صحابی تھے۔ اسی طرح شرحبیل بن سعد کے علاوہ شرحبیل بن سعید، ابن شریک، ابن مسلم، ابن یزید اور ابن حکم وغیرہ مشہور محدثین میں سے ہیں۔

4- عبرانی کا لفظ ''راحیل'' اسلام میں بطور علم کبھی استعمال نہیں ہوا اور یہ لفظ عربی فارسی اور اردو زبان و لغت کا کبھی حصہ نہیں رہا۔ البتہ بطور نام مسلمانوں میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ عربی زبان کا لفظ ''رحیل'' (بغیر الف کے) یا ''راحل'' (بغیر یاء کے) ہے۔ اس لفظ کے مادے سے بننے والے متعدد الفاظ ہماری زبان کا حصہ ہیں جیسے: رحلت، ارتحال، مراحل، رحل وغیرہ۔ رحیل کا معنی سفر یا تیز رو ہے اور راحل کا معنی مسافر وغیرہ ہے، دونوں لفظ مذکر ہیں اور غالباً ''راحیل'' انھی میں سے کسی کی بگڑی شکل ہے۔ عبرانی کے ''راحیل'' سے اس کا تعلق شاید نہ ہو۔

■ **محمد عرفان، محلہ میر مست، ہاؤس نمبر-11، جونپور-222001**

''اردو دنیا'' میں اردو کے بلند پایہ نقاد اور ادیب محترم شمس الرحمن فاروقی صاحب کا تحریر کردہ ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' ہم طلبہ کے لیے انتہائی مفید اور کارآمد ہے جس سے ہماری معلومات میں گرانقدر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس

کو لگاتار جاری رہنا چاہیے۔ ممکن ہو تو متعلقہ صفحات کو اس طرح شامل کریں کہ اگر ان کو نکال کر علاحدہ جلد بندی کرائی جائے تو آسانی ہو سکے۔

فروری 2007 کے شمارے میں محترم فاروقی صاحب نے ایک لفظ "شرجیل" پر روشنی ڈالی ہے مگر اسی لفظ کے بارے میں مولانا تقی محمد عثمانی صاحب اپنے مشہور سفرنامے "جہانِ دیدہ" میں دوسری طرح وضاحت کرتے ہیں۔

"جہانِ دیدہ" کے صفحہ 200 کی ضمنی سرخی کے تحت تحریر ہے کہ:

"حضرت شرجیل بن حسنہ کا مزار۔

حضرت شرحبیل بن حسنہ اپنی والدہ کی طرف منسوب ہیں جن کا نام حسنہ تھا۔ یہ بھی دورِ اول کے مسلمانوں میں سے ہیں جنھوں نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ کی طرف بھی۔ فٹ نوٹ: شین پر پیش، راء پر زبر، حاء ساکن اور با مکسور ہے۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں تک کو ان کا نام "شرجیل"، "جیم" سے لیتے ہوئے سنا جو غلط ہے۔"

"جہانِ دیدہ" صفحہ نمبر-200، زمزم بکڈپو، دیوبند

جواب از جناب شمس الرحمٰن فاروقی

میں ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی اور جناب محمد عرفان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ ان کی وجہ سے میں اپنی غلطی پر متنبہ ہو سکا کہ جس لفظ کو میں بچپن سے شرجیل بروزن تفصیل پڑھتا رہا تھا وہ دراصل شُرَحبیل بروزن مفاعیل ہے۔ جزا کماللہ۔ جیسا کہ محمد عرفان صاحب نے مولانا تقی عثمانی کے اقتباس کے ذریعے واضح کیا ہے، اس لفظ کو شرجیل بروزن تفعیل پڑھتے ہوئے کئی لوگوں کو سنا گیا ہے۔ قارئین براہ کرم میرے اس بیان کو کالعدم قرار دیں جہاں میں نے شرجیل کو بروزن تفعیل بتایا ہے۔

لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ شرجیل بروزن تفعیل کئی لوگوں کا نام سنا گیا ہے۔ مثلاً اردو کے معروف اہل قلم اور میرے کرم فرما جناب شرجیل احمد خاں ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے نام کے کیا معنی ہیں تو انھوں نے متحقق طور پر کہنے سے معذوری ظاہر کی لیکن بتایا کہ شرجیل بروزن تفعیل شاید عبرانی لفظ ہے۔ وہ اس کے معنی کے بارے میں بھی یقین سے نہ کہہ سکے، لیکن ان کی اطلاع کے بموجب شرجیل بروزن تفعیل بمعنی "عقل مند، بزرگ" وغیرہ ہے۔ انھوں نے بتایا اور مجھے بھی کچھ خیال آتا ہے کہ کولکاتا میں ایک "شرجیل بک ڈپو" بھی ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ "شرجیل" بروزن تفعیل اردو میں ایک نام ہے۔ کوئی صاحب عبرانی جانتے ہوں تو براہ کرم ہماری معلومات میں اضافہ کریں۔

جہاں تک سوال "مطاہر" کا ہے تو میں نے کہیں دیکھا ہے کہ آنحضرت کے صاحب زادگان کے نام طاہر، مطاہر بھی بتائے گئے ہیں۔ اس وقت میں حوالہ دینے سے قاصر ہوں، لیکن اس لفظ کو "لغوی" اعتبار سے "نادرست" نہیں کہا جا سکتا۔

مطاہر مع اول مفتوح و چہارم مکسور بروزن معارف کے معنی ہیں "پاک و صاف چیزیں، ذریعۂ طہارت، مثلاً آفتاب، یا مجازاً پانی۔" چنانچہ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں مطاہر بروزن معارف کے لیے سند درج ہے: "اس میں سقایات مطاہر وضو و غسل کے واسطے بکثرت ہیں۔" (ترجمۂ سفرنامۂ ابن بطوطہ، 1901)۔

مطاہر مع اول مضموم و چہارم مکسور بروزن مقابل کے معنی ہیں "پاک صاف کرنے والا، طاہر، طہارت والا، مجازاً پاک و صاف"، "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں مطاہر بروزن مقابل کی سند میں یہ شعر درج ہے۔

اگرچہ کیفیت تھی اس میں ظاہر
دلے یہ کیفیت تھی سب مطاہر

(مثنوی مصباح المجالس، 1857)

میں عربی بہت کم جانتا ہوں لیکن میری اطلاع کے مطابق دونوں الفاظ ط ہ ر سے مشتق ہیں۔

عبرانی لفظ "راحیل" کبھی اسلام میں بطور علم نہیں استعمال ہوا، یہ اطلاع میرے لیے قابل قبول نہیں، کیونکہ حضرت یعقوب نبی تھے اور راحیل ان کی بیوی تھیں لہٰذا اس نام کو خارج از اسلام نہیں کہہ سکتے۔ رہا سوال اس بات کا، کہ "یہ لفظ عربی فارسی اور اردو زبان و لغت کا حصہ کبھی نہیں رہا" تو "فرہنگ آنندراج" میں راحیل درج ہے اور اسے عبرانی لفظ بتاتے ہوئے معنی بتائے گئے ہیں "والدۂ حضرت یوسف علیہ السلام۔" میں نے مزید تصدیق کے لیے "اردو لغت، تاریخی اصول پر" دیکھی تو معلوم ہوا کہ "راحیل" نام کا ایک فرشتہ بھی ہے۔ چنانچہ "غزوات حیدری" (1855) سے مندرجۂ ذیل سند وہاں درج ہے: "راحیل ایک فرشتہ ہے کہ خوش بیان و نیکو بیان اس سے زیادہ کوئی فرشتہ نہیں۔" مزید سند کے طور پر میر انیس کا حسب ذیل شعر درج ہے۔

منبر پہ جا کے عقد ہے راحیل نے پڑھا
سارے مَلَک گواہ ہیں یا ختم انبیا

یہاں بھی قرینہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ راحیل کوئی فرشتہ ہے۔

دوسری بات یہ کہ سوال کنندہ کا یہ پوچھنا کہ "راحیل" نام آج کل سننے میں آتا ہے، اس کی اصل کیا ہے، یہ ثابت کرتا ہے کہ اردو میں "راحیل" بطور علم مستعمل ہے۔

جائسی صاحب کا یہ قول بالکل درست ہے کہ زبان، لغت کے معاملات میں کتابت کا سہو بھی اہم ہوتا ہے کیوں کہ اس سے غلط فہمی پھیل سکتی ہے لہٰذا وضاحتاً عرض ہے کہ "مضموم" کی جگہ "مضمون" سہو کاتب ہے۔

کمپوزنگ کی اس غلطی کے لیے ماہنامہ "اردو دنیا" کے اپریل 2007 کے شمارے میں ادارے کی جانب سے معذرت کر لی گئی تھی۔

ادارہ

ہماری بات

8، 9 اور 10 مئی کو قومی اردو کونسل اور کیندریہ ہندی سنستھان کے اشتراک سے ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے آڈیٹوریم میں ایک سہ روزہ سیمینار کا انعقاد ہوا۔ سیمینار کا موضوع تھا: ''1857: نشاۃ ثانیہ اور ہندوستانی زبانیں۔'' اس کل ہند سیمینار کا افتتاح مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے کیا۔ انھوں نے اپنی پرمغز افتتاحی تقریر میں کہا کہ 1857 کی جنگ آزادی کے پیچھے جو جذبات کارفرما تھے، ان کی روح کو سمجھنا اور ان جذبات کو دوبارہ زندہ کرنا، ان شہیدوں کو سچا خراج عقیدت ہوگا جنھوں نے استخلاصِ وطن کی خاطر اپنی زندگیاں قربان کردیں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اگرچہ 1857 کی قومی بغاوت سے قبل بھی ملک کے آدی واسیوں، کسانوں، مزدوروں اور دستکاروں نے سامراجی حکومت کے آمرانہ طور طریقوں کے خلاف تحریکیں چلائی تھیں اور کچھ دیسی حکمرانوں نے بھی علم بغاوت بلند کیا تھا، لیکن 1857 کی ملک گیر بغاوت نے قومی سطح کی سوچ اور سیاسی بیداری پیدا کی اور ہندوستانی شہریوں کو وحدت کی ایک لڑی میں پرو دیا۔ جناب ارجن سنگھ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ باہمی یک جہتی کا جو جذبہ اس وقت پیدا ہوا تھا اور جس طرح پوری قوم قدم سے قدم ملا کر ایک ارفع واعلا مقصد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، آج بھی اس جذبے کو بحال کرنے اور اسے مزید مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ 1857 کا تاریخی موڑ ہماری قومی زندگی کا ایک ناقابل فراموش اور قابل فخر پڑاؤ تھا۔ اب اسی جذبے کے ساتھ ہمیں وطن کی تعمیر نو کی منزلیں بھی سر کرنی ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) کے چیئرمین اور مشہور مورخ پروفیسر وپن چندرا نے اس موقعے پر کہا کہ اس دور کے لوک گیتوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرد، عورت، بوڑھے، بچے جوان سب کے سب اس تحریک سے کس قدر متاثر ہوئے تھے۔ ان گیتوں نے باغیوں کے دلوں میں جو ولولہ اور جوش پیدا کیا ہوگا آج ہم شاید اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ بھی نہ کرسکیں لیکن یہ گیت آج بھی ولولہ انگیز ہیں اور ہمیں حبِ وطن کا درس دیتے ہیں۔ انھوں نے جنگ آزادی میں اردو کے اہم کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ زبان نہ ہوتی تو اس لڑائی کے بہت سے پہلو ہماری نظروں سے اوجھل رہتے۔ جنگ آزادی کے بارے میں کچھ لکھنا آسان نہیں تھا، جان و مال دونوں خطرے میں پڑ سکتے تھے لیکن اردو کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے یہ خطرہ مول لیا اور بدیسی حکومت کے خلاف ایک ذہنی فضا تیار کی۔ اس وقت کے اردو اخبارات میں جو کچھ چھپتا رہا ہے وہ حق گوئی اور بے باکی کی تابندہ مثال ہے۔ بعد کے مورخوں نے اسے پڑھ کر ہی 1857 کی تاریخ مرتب کی ہے۔

پروفیسر سویا ساچی بھٹاچاریہ نے کہا کہ جس طرح اس دور کے مختلف زبانوں کے قلمکاروں نے مذہبی تفریق سے قطع نظر کرکے اپنی اپنی زبانوں میں وطن دوستی کے جذبے کو فروغ دیا، ضرورت اس بات کی ہے کہ آج بھی ہم ان مسائل سے جو ہمیں درپیش ہیں، اسی طرح نبرد آزما ہوں۔ ذات پات کی تفریق، علاقائی تعصب، اونچ نیچ کا ٹکراؤ، یہ ہمارے آج کے مسائل ہیں جن پر توجہ کی ضرورت ہے۔

کیندریہ ہندی سنستھان کے جناب رام شرن جوشی نے اپنے افتتاحی کلمات میں اس بات پر زور دیا کہ 1857 کی جنگ آزادی کو جو بیرونی دباؤ اور غیرملکیوں کی طرف سے کیے جانے والے جبر و ستم کے خلاف عوامی غم و غصہ کا اظہار تھی، اسے نہ صرف ہمیں یاد رکھنا چاہیے بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کو بھی اس سے باخبر کرتے رہنا چاہیے۔

آخر میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ سیمینار جنگ آزادی کی یادوں کو تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کو فروغ دینے کی سمت بھی ایک قدم ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوں تو ہندوستان کی سبھی زبانوں میں بہت سی مشترک باتیں پائی جاتی ہیں لیکن اردو اور ہندی کا تو بنیادی ڈھانچہ ہی ایک ہے جو کھڑی بولی کی دین ہے۔ اردو کونسل اور ہندی سنستھان کی طرف سے مشترکہ طور پر اس سیمینار کا انعقاد بھی اس قربت کو ظاہر کرتا ہے۔ انھوں نے ان مورخوں سے اختلاف کیا جو 1857 کی جنگ آزادی کو محض شخصی اقتدار کی واپسی کی لڑائی مانتے ہیں اور کہا کہ یہ لڑائی قومی وقار کی بحالی کے لیے لڑی گئی تھی اور اس میں صرف حکمراں نہیں عوام بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے اس موقعے پر بیگم حضرت محل کو بھی یاد کیا اور محترم ارجن سنگھ صاحب کی موجودگی میں حکومت ہند سے اپیل کی کہ حضرت محل کا مزار جو کاٹھ منڈو (نیپال) میں انتہائی خستہ حالت میں ہے، اپنے خرچ سے اس کی مرمت کرائے اور حکومتِ نیپال سے رابطہ قائم کرکے اس کی دیکھ بھال کا نظم اپنے ذمے لے لے۔ ہال میں موجود سبھی حاضرین نے اس کی پرزور تائید کی۔

ہندوستان بہت سی قومیتوں، ثقافتوں، زبانوں بہت سے مذہبوں اور مختلف النوع رسم و رواج کا گہوارہ ہے۔ ماحول کی مناسبت سے یہاں کے باشندوں کے عادات و اطوار میں بھی فرق ہے لیکن ہندوستانیت تمام ہندوستانیوں کا مشترکہ وصف ہے۔ آزمائش کے موقعوں پر یہ وصف اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور کثرت میں وحدت کے وہ جلوے دکھاتا ہے جو آنکھوں کو روشنی اور دل و دماغ کو تابندگی عطا کرتے ہیں۔

سیمینار کی روداد اور کچھ تصویری جھلکیاں اس شمارے میں شائع کی جارہی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

اس کالم میں اردو روزمرہ اور اردو زبان کے بارے میں قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ ایک وقت میں تین سے زیادہ سوالات نہ پوچھے جائیں اور سوالات کا تعلق الفاظ کے استعمال، روزمرہ میں ان کے صرف اور ان کے معنی کے بارے میں ہو۔ ادارہ

سوال: ''تیاری'' اور ''طیاری'' میں کیا فرق ہے؟ صحیح استعمال کیا ہونا چاہیے؟

جواب: دونوں کے معنی ایک ہیں، یعنی ''مہیا، آمادہ''۔ لیکن پرانے زمانے میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ''تیار'' کوئی لفظ نہیں، اصل میں یہ عربی کا ''طیار'' ہے، بمعنی ''اڑنے والا'' اور اس سے ''مہیا، آمادہ'' کے معنی بنا لیے گئے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے، کیونکہ عربی میں ''طیار'' کے معنی ہیں، ''منتشر''، نہ کہ ''آمادہ، مہیا''۔ بہر حال، اگر ''طیار'' غلط نہ بھی ہو تو بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ اب اردو میں ''تیار'' ہی مستعمل ہے اور یہی درست ہے۔

سوال: ''ڈھانکنا'' اور ڈھانپنا'' میں کیا فرق ہے؟ غالب نے ''ڈھانپنا'' استعمال کیا ہے۔ صحیح کیا ہے؟

جواب: دونوں صحیح ہیں، لیکن اب ''ڈھانپنا'' بہت کم بولا جاتا ہے۔ بعض استعمالات میں ''ڈھانپنا'' زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے، مثلاً ''دھوپ میں سر کو ڈھانپے رہنا اچھا ہے۔''

(سوالات از محمد یعقوب فاروقی، نصیر آباد، گورکھ پور، یوپی)

سوال: جس عورت کا شوہر مر جاتا ہے وہ بیوہ کہلاتی ہے۔ جس مرد کی بیوی انتقال کر جاتی ہے اس مرد کو کیا کہیں گے؟

جواب: اردو میں ایسے شخص کو ''رنڈوا'' کہتے ہیں۔ ہمارے یہاں ''بیوہ'' کے لیے ایک لفظ ''رانڈ'' بھی ہے۔ اس سے لفظ ''رنڈوا'' بنا لیا گیا۔

(سوال از طیب احسن تابش، حاجی لائن، رانچی 834001)

سوال: دانش منداور دانشور میں کیا صحیح ہے، یا ان میں کیا فرق ہے؟ ''دانش مند'' بہت پرانا لفظ ہے، بمعنی ''عقل مند''۔ شیخ سعدی کا شعر ہے (گلستاں)۔

چار پائے برو کتابے چند
نہ محقق بود نہ دانش مند

''دانشور'' کے بھی یہی معنی تھے، لیکن یہ لفظ بہت پرانا نہیں ہے۔ ''فرہنگِ آصفیہ'' میں ''دانشور'' درج نہیں، ''نور اللغات'' میں ''دانشور'' بمعنی ''دانشمند'' ملتا ہے۔ زمانۂ حال میں اسے انگریزی لفظ Intellectual کے معنی میں بولتے ہیں۔

سوال: ''گر'' بمعنی ''بنانے والا'' مثلاً روغن گر، آہن گر، تیر گر، پتنگ گر، شیشہ گر۔ اس طرز پر ''دہشت گر'' ہونا چاہیے۔ ''دہشت گرد'' کیوں استعمال ہوتا ہے؟

جواب: ''گر'' اور ''گرد'' ایک نہیں ہیں۔ اصل لفظ ''دہشت گردی'' ہے، جس سے ی حذف کر کے ''دہشت گرد'' بھی بنا لیا گیا۔ انگریزی میں اسے Back Formation کہتے ہیں۔ ''گرد'' جو ''دہشت گرد'' میں ہے وہ ''گر'' سے مختلف لاحقہ ہے اور اس کے معنی ہیں ''گھومنے پھرنے والا''، لہٰذا ''آزادی سے، درانہ عمل کرنے والا۔'' اردو میں یہ ہمیشہ برے مفہوم کو ادا کرتا ہے، مثلاً ''نادر گردی''؛ ''مرہٹہ گردی''؛ ''غنڈہ گردی'' وغیرہ۔

(سوالات از ثاقب صدیقی، میڈیکل روڈ، نزد اسٹیٹ بینک، علی گڑھ)

سوال: شمالی ہند میں اعلا، ادنا، لکھا جاتا ہے، جب کہ جنوبی ہند میں اعلیٰ ادنیٰ لکھا جاتا ہے، دو املوں سے قاری شش و پنج میں مبتلا ہے۔ صحیح کیا ہے؟

جواب: شمالی ہند میں سب لوگ نہیں، کچھ لوگ، اور کچھ ادارے ''اعلا''، ''ادنا''؛ ''دعوا'' وغیرہ لکھتے ہیں۔ یہ املا میری نظر میں مستند یا مرجح نہیں۔ ایک زمانے میں کچھ لوگوں کو اردو زبان اور املا کی ''اصلاح'' کا بہت شوق تھا۔ ''اعلیٰ، ادنیٰ، دعویٰ'' کے یہ املے اسی کی یادگار ہیں۔ میں انھیں قابلِ ترک سمجھتا ہوں کیونکہ یہ ابھی پوری طرح رائج

بھی نہیں ہوئے ہیں۔

سوال: رشید حسن خاں صاحب نے عیسیٰ، موسیٰ، رحمٰن، جیسے الفاظ کو عیسا، موسا، رحمان اسماعیل، وغیرہ لکھا، کیا ایسا لکھنا درست ہے، جب کہ مذکورہ الفاظ عربی کے ہیں اور ہمارے عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں؟

جواب: معاملہ صرف عربی زبان یا عقیدے کا نہیں، معاملہ رواج عام کا ہے۔ روسی زبان میں نہ چھوٹی ہ ہے، نہ بڑی ح، لہٰذا وہ لوگ اسم پاک محمد کو مخمد (مع خ) لکھتے اور بولتے ہیں۔ ترکی زبان میں پ نہیں اور ان کے یہاں الف سے شروع ہونے والے اکثر الفاظ میں الف پر زیر ہوتا ہے۔ پس وہ لوگ حضرت ابو ایوب انصاری صحابی کا نام یوں لکھتے ہیں Epu Eyup۔ تو کیا اب روسی بولنے والوں سے کہا جائے کہ تم چھوٹی اور بڑی ح کہیں سے لاکر اپنے یہاں شامل کرو؟ کیا ترکوں سے کہا جائے کہ تم حرف ب کہیں سے لاؤ اور لفظ کے الف اول پر زیر لگانا چھوڑ دو؟ اصل بات یہ ہے جو رائج ہو جائے وہی درست ہے۔ اچھے خاصے رائج املا سے بے وجہ چھیڑ خانی کرنے میں زبان کا نقصان ہے، فائدہ بالکل نہیں۔ ''اسمٰعیل'' کو بعض بہت دن سے ''اسماعیل'' اور مجرد ''رحمٰن'' کو بعض لوگ بہت دن سے ''رحمان'' لکھتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا ان دو لفظوں کے لیے اسمٰعیل/ اسماعیل؛ رحمٰن/ رحمان'' دونوں املا صحیح مانے جائیں گے۔ باقی کے املا میں ردو بدل کرنا غیر ضروری ہے۔ رشید حسن خاں مرحوم بہت بڑے عالم تھے لیکن ان کی ہر بات ماننا ضروری نہیں۔

سوال: اردو میں بعض اصطلاحیں ایسی ہیں جن کے صحیح معنی معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میر حسن نے ''من'' استعمال کیا ہے۔ ''غزل'' کے لغوی معنی اکثر یہ بتائے جاتے ہیں کہ جب جنگل میں شیر ہرن پر حملہ کرتا ہے تو اس کے گلے سے ایک آواز نکلتی ہے، اسے ''غزل'' کہتے ہیں، بھلا بتائیے بچوں کو کیسے سمجھائیں کہ وہ آواز کیسی ہوتی ہے؟

جواب: میں ''من'' نامی کسی ادبی اصطلاح سے واقف نہیں ہوں۔ میر حسن کی ''سحر البیان'' اور ان کا تذکرہ دیکھا، یہ اصطلاح نظر سے نہیں گزری۔ براہ کرم صراحت فرمائیے کہ یہ اصطلاح آپ نے میر حسن (یا کسی اور) کے یہاں کہاں دیکھی ہے؟

''غزل'' کے سیدھے سادے معنی ہیں، ''عورتوں کا ذکر کرنا، اور ان سے اپنے عشق کی باتیں بیان کرنا اور عورتوں کی تعریف اور ان سے عشق کا ذکر کرنا۔'' لیکن چونکہ غزل میں بہت سے مضامین درد انگیز یا حزن آلود بیان ہوتے ہیں لہٰذا کسی من چلے نے یہ کہہ دیا کہ غزل دل پر اسی طرح اثر کرتی ہے جس طرح شیر کے پنجے کے نیچے آئے ہوئے آہو کی چیخ اثر کرتی ہے۔ یہ تعریف نہیں محض ایک تاثراتی بیان ہے، اسے کچھ اہمیت نہ دینی چاہیے۔

(سوالات از محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد، آندھرا پردیش)

سوال: ''امید'' اور ''توقع'' میں کیا فرق ہے؟

جواب: ''توقع'' عمومی لفظ ہے، اس میں اچھا، برا، اور غیر جانب دار (یعنی عامۃ الورود) تینوں پہلو ہیں۔ لہٰذا یہ بڑی حد تک ''امکان'' کے معنی رکھتا ہے۔ مثلاً:

(1) مجھے ان سے جو توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی۔

(2) توقع ہے کہ اس بار وہ کامیاب نہ ہوگا۔

معنی کی شدت کے اعتبار سے ''توقع'' کے نیچے ''اندیشہ'' ہے، جس کے معنی ''خوف'' کے ہیں، اور توقع کے اوپر ''امید'' ہے، جو ہمیشہ اچھے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

مندرجۂ ذیل پر غور کیجیے:

(1) آج بارش کی توقع ہے۔ (یعنی کہنے والے کے دل میں کوئی خوف یا امید یا تمنا نہیں ہے کہ بارش ہو۔ وہ صرف ایک اطلاع دے رہا ہے۔)

(2) آج بارش کا اندیشہ ہے (یعنی کہنے والے کے دل میں بارش کا خوف ہے۔)

(3) آج بارش کی امید ہے۔ (یعنی کہنے والے کو بارش کی تمنا تھی اور آج اس کے پورے ہونے کا امکان ہے۔)

آپ نے غالب کا شعر نقل کیا ہے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

یہاں ظاہر ہے کہ متکلم عمومی بات کہہ رہا ہے کہ مجھے نہ کسی سے کچھ اندیشہ ہے، نہ کسی سے کچھ امید ہے۔ یعنی میرے خیال میں اب کسی بات کا امکان ہی باقی نہیں، تو پھر کسی اچھی بات کے نہ ہونے یا کسی بری بات کے واقع ہونے کا گلہ کیوں ہو؟

آپ نے غالب کا ایک اور شعر نقل کیا ہے۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

یہاں بھی ظاہر ہے کہ ''وفا'' اچھی چیز ہے، اور متکلم امید کرتا ہے یعنی چاہتا ہے، تمنا کرتا ہے میرے ساتھ وفا کی جائے گی۔

ایک آخری مثال:

(1) امید ہے کہ مریض آج رات مر جائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہاں عام حالات میں ''اندیشہ'' کا محل ہے۔ لیکن اگر کہنے والا شخص مریض کا دشمن ہے، تو ''امید'' کا محل ہے۔ اور اگر کہنے والے کو اس بات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں کہ مریض مرے یا بچ جائے تو وہ کہے گا:

(2) توقع ہے کہ مریض...

سوال: (1) گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

(2) گزر کر سامنے سے اس لیے پھر اس نے دیکھا ہے
گرا ہے یا نہیں وہ صید جس پر تیر پھینکا ہے

''لیے'' اپنے محل کے لحاظ سے [ان دو شعروں میں] صحیح ہے یا نہیں؟

جواب: غالب کے شعر میں ''لیے'' الگ سے نہیں، بلکہ ''قدم لینا'' بمعنی ''قدم چھونا'' محاورے کا حصہ ہے۔ ''قدم لیے'' بمعنی ''قدم چھوئے'' بالکل درست ہے۔ دوسرے شعر میں ''لیے'' کلمہ متعلق فعل ہے اور اس کے معنی ہیں ''واسطے، وجہ سے'' وغیرہ۔ شعر زیرِ بحث میں یہ بالکل درست استعمال ہوا ہے۔

سوال: کیا جواہر لعل، رام لعل، وغیرہ میں ''لعل'' کے بجائے ''لال'' لکھنا غلط ہے۔؟

جواب: دونوں صحیح ہیں۔ صاحب اسم کو اختیار ہے، جس کا جو جی چاہے لکھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، پنڈت نہرو ہمیشہ جواہر لعل لکھتے تھے۔ رام لال اکثر و بیشتر ''لال'' لکھتے تھے۔ کشمیری لال ذاکر ہمیشہ ''لال'' لکھتے ہیں۔

''لال'' بمعنی یاقوت فارسی میں ہے اور ''لعل'' اس کا معرب ہے۔ لہٰذا دونوں صحیح ہیں۔

(سوالات از محمد منصور عالم، گیا، بہار)

سوال: اکثر ''طوطا'' ط سے لکھا جاتا ہے، لیکن آج کل ''توتا'' بھی لکھا جا رہا ہے۔ کون سا املا مرجح ہے؟

جواب: یہ بحث بہت لمبی ہے اور اس پر میں کئی بار کلام کر چکا ہوں۔ فی الحال اتنا عرض کروں گا کہ میں ''طوطا'' کو ''توتا'' لکھنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ ''توتا'' ابھی پوری طرح رائج بھی نہیں۔ اس کا ترک بہتر ہے۔

سوال: یوپی میں جمع بولنے کا رواج ہے: ''کاشف چپاتیاں کھا رہا ہے'' لیکن ''چپاتی کھا رہا ہے'' بھی درست ہوسکتا ہے۔ کون سا جملہ لکھنا زیادہ درست ہوگا؟

جواب: بے شک دہلی اور مغربی یوپی میں اس طرح کی جمع بولنے کا رواج ہے۔ مشرق اور زیادہ تر دکن میں اس طرح کی جمع کا رواج نہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ مثلاً:

سوال: کاشف کیا کھا رہا ہے؟ جواب: چپاتیاں کھا رہا ہے/ چپاتی کھا رہا ہے۔

سوال: کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ جواب: سب روٹیاں سوکھی ہوئی ہیں/ ساری روٹی سوکھی ہوئی ہے۔ وغیرہ اسی پر قیاس کرلیں۔

سوال: رفعت، ثروت، صولت، یہ نام لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے رکھے جاتے ہیں۔ زیادہ بہتر کس کے لیے ہوگا؟

جواب: نام کے لیے شرط یہ ہے کہ اچھے معنی رکھتا ہو، اور بزرگوں کے نام پر ہو تو اور بھی خوب ہے۔ اردو میں یہ خوبی ہے کہ بہت سے مونث الفاظ کو بھی مردوں کا نام بنا لیتے ہیں، اور بہت سے مذکر الفاظ کو عورتوں کا نام بنا لیتے ہیں۔ آپ کے لکھے ہوئے نام عورت اور مرد دونوں کے لیے ٹھیک ہیں۔ عورتوں کے نام ہوں تو ساتھ میں ''فاطمہ''، ''بیگم؛ خاتون''، وغیرہ عموماً بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن نہ بڑھائیں تو بھی کوئی ہرج نہیں۔

(سوالات از سیمیں کلی، حکیم چک، رفیع گنج، اورنگ آباد، بہار)

''اردو دنیا'' کے قارئین میں اس کالم کی خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔ حال ہی میں بعض سوالات ایسے ارسال کیے گئے ہیں جن کا تعلق محض عربی اور فارسی زبان کے الفاظ اور ان کے معانی سے ہے۔ اگرچہ ان سبھی سوالات کے جوابات محترم شمس الرحمن فاروقی صاحب کی جانب سے دیے جارہے ہیں لیکن آئندہ سوالات کرتے وقت یہ خیال رہے کہ ارسال کردہ جملہ سوالات کا تعلق صرف اردو زبان اور اس کے روز مرہ سے ہو۔

سوالات ارسال کرنے والے حضرات اپنے نام کے ساتھ مکمل پتہ بھی ارسال کریں۔

ادارہ

محی الدین کٹی

ریاست کیرالا میں اردو درس و تدریس کے مسائل

سرزمین کیرالا میں آزادی سے پہلے اردو کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جانے سے بہت پہلے ہی مسجدوں،مکتبوں اور دینی درسگاہوں میں اردو پڑھائی جاتی تھی۔ ملا پورم، کالی کٹ، کنور، کاسرگوڑھ، پال گھاٹ تلاشیری کے علاقوں میں عربی کے ساتھ اردو بھی پڑھنے کی سہولت میسر تھی۔ 1943 میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو زبان کی اشاعت کے سلسلے میں کالی کٹ کی ایک کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس وقت انجمن ترقی اردو ہند کیرالا شاخ کا افتتاح کیا گیا۔کانفرنس کے فیصلے کے مطابق ریاست میں مختلف مقامات پر اردو کلاس شروع کیے گئے کلاس کے معائنے کے لیے سید محمد سرور صاحب اور مقبول احمد صاحب مقرر ہوئے تھے۔اسی طرح کئی رضا کار انجمنوں نے ریاست کے مختلف علاقوں میں اردو زبان دانی کے لیے کلاس شروع کیے۔

انگریزوں کے زمانے میں تعلیم کو عام کرنے کی مہم چلائی گئی اور اس سلسلے میں گنتی کے چند اسکولوں میں اردو کی تعلیم بھی شروع ہوگئی۔ ملا پورم ہائی اسکول، کنور اور کاسرگوڑھ کے ہائی اسکول، کالی کٹ کا جے.ڈی.ٹی. ہائی اسکول کالی کٹ، کوچین کا عیسیٰ موسیٰ ہائی اسکول، تلاشیری کے سینٹ جوزف ہائی اسکول، برفن ہائی اسکول وغیرہ ان میں مشہور ہیں۔ بعد میں اسکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ کی قلت محسوس ہوئی تو مختلف رضاکار انجمنوں اور محبان اردو نے اردو کورس شروع کیے۔ انجمن اصلاح اللسان، انجمن اشاعت اردو، اردو پرچار سبھا، اردو پرچار سمیتی، اردو لورز ایسوسی ایشن، اردو ڈولپمنٹ ایسوسی ایشن وغیرہ اداروں کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ 1965 میں خواجہ احمد فاروقی نے کیرالا کی اردو کلاسوں کا معائنہ کیا تھا۔اردو کی اشاعت کی لگاتار کوششیں ہوتی رہیں۔ سیتی صاحب، احمد کٹر کل، سی انچ محمد کویا، جیسے سیاسی لیڈروں کی لگاتار کوششیں سید محمد سرور صاحب اور ان کے ساتھیوں کی سرتوڑ محنت کی وجہ سے بعد میں کیرالا یونیورسٹی میں اردو ادیب فاضل کورس شروع کرنے کا فیصلہ ہوا جو بعد میں کالی کٹ یونیورسٹی میں تبدیل ہوئی۔ اس کے ساتھ سرکار نے اردو ہائیر ایکوامینیشن نامی ایک امتحان بھی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دوسالہ کورس کو پاس کرنے والا پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر کی حیثیت سے کام کرسکتا تھا۔پھر چراغ سے چراغ جلتے رہے، اب ریاست کیرالا میں تقریباً 2000 اسکولوں میں اردو، پڑھائی جاتی ہے۔ ان میں ہائیر سکنڈری سطح پر سو کے قریب اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ان میں تروننتا پورم اور کوچین کے علاقے میں اردو پڑھنے والے بچوں کی تعداد کم ہے جب کہ ملابار کے علاقے میں زیادہ ہیں۔ یعنی (ملا پورم، کالی کٹ، کنور، کاسرگوڑھ، واناڈ، ترشور، پال گھاٹ وغیرہ اضلاع میں دو لاکھ کے قریب طلبہ اردو پڑھتے ہیں۔ یہاں پر زبان اردو کی تعلیم پانچویں جماعت سے شروع ہوتی ہے اردو کسی کی بھی مادری زبان نہیں ہے۔ اس لیے ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ طلبہ اردو، عربی، سنسکرت ان میں سے کوئی ایک زبان اختیار کرسکتے ہیں۔ ریاست میں کوئی بھی اردو میڈیم اسکول نہیں ہے۔

ریاست کیرالا میں 1985 سے پہلے دیگر ریاستوں کی اردو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ایک زمانے تک تامل ناڈو کی کتابیں پڑھائی گئیں پھر آندھرا پردیش کی کتابیں۔ وہاں کی پہلی سے پانچویں تک کی کتابیں یہاں پانچویں سے دسویں جماعت تک پڑھائی جاتی تھیں۔ پھر ایسا ہوا کہ آندھرا پردیش اردو اکادمی کی زیرنگرانی ماہرین یہاں کیرالا میں آکر کتابیں تیار کرنے لگے۔ 1985 کے بعد ریاست ہی میں درسی کتابیں تیار ہونے لگیں۔ یہاں کے مختلف کالجوں، یونیورسٹیوں کے ماہرین، باہر سے آئے ہوئے ماہرین تعلیم اسکولوں کے اساتذہ مختلف ورک شاپ میں مل بیٹھتے اور کتابیں تیار کرتے۔ اس طرح ہر پانچ سال میں کتابیں بدلتی رہیں یہاں نصاب اور کتاب کی ذمہ داری SCERT کی ہے۔ٹیکسٹ بک ورکشاپ میں ڈاکٹر اخلاق اثر، بھوپال، ڈاکٹر وجیہہ الدین، وارنگل، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، ڈاکٹر ن.م.سعید، بنگلور، پروفیسر غوث محی الدین، آندھرا پردیش نے شرکت کی۔ تقریباً ایک ٹائٹل کی تیاری کے لیے 15 ماہرین پر مشتمل 40 دن کے ورک شاپ کئی مرتبہ کرنے پڑتے تھے۔ کتابوں کے ساتھ اساتذہ کے لیے رہنما کتاب بھی تیار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں نئے نصاب کی خصوصیات، بنیادی اور نظریاتی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ دوسرے حصے میں درسی کتاب کے ہر ایک سبق کے بارے میں طریقۂ تدریس اور سرگرمیوں کے عمل میں لانے کا تفصیل سے بیان ہوتا ہے۔تیسرے حصے میں تمام ضروری معلومات، دیگر وسائل برائے تعلیم، کتابوں اور رسالوں کے لیے

ڈوٹ کوم، وغیرہ دیے جاتے ہیں۔ اس سے اساتذہ کو ریفرنس کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

گذشتہ کچھ مدت سے ریاست کیرالا کے نصاب میں تجدید کا عمل جاری ہے۔ اور اس کے پیش نظر درسی کتابوں کی تجدید کا عمل بھی جاری ہے۔ اب یہ تبدیلی بارھویں جماعت تک پہنچ گئی ہے۔ زبان کی تعلیم و تدریس میں روایتی طریقۂ کار ناکام ثابت ہوئے تو ماہرین تعلیم نے زبان کی تدریس کے لیے ایک نئے طریقۂ کار کی تشکیل کی۔ نئے طرز نظر، تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے فطری اور غیر رسمی ماحول میں بچوں کو زبانوں کے سننے، بولنے، اور استعمال کرنے کے مواقع فراہم کرنا۔ جس سے زبان کی تعلیم کے مطلوبہ مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بچے تو فطری طور پر کھیل کے شائق ہوتے ہیں۔ اور آزادی چاہتے ہیں وہ کسی طرح کے ذہنی دباؤ اور جسمانی تکلیف کو پسند نہیں کرتے بچوں میں، مشاہدہ کرنے، مقابلہ کرنے، تجزیہ کر کے نتیجے پر پہنچنے کا فطری جذبہ ہوتا ہے۔ اسی لیے تعلیم کو زیادہ موثر، دلکش اور کارگر بنانے کے لیے عملی سرگرمی پر مبنی مسرت خیز تعلیم کو اہمیت دی گئی ہے۔ نئے نصاب میں بچوں کو مرکزیت حاصل ہے۔ بچوں کی تخلیقی صلاحیت ابھارنے کے لیے مختلف مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ اب زبان کے کلاس روم میں استاد اور طالب علم دونوں کے رول بدل گئے ہیں۔ طریقۂ تدریس، تعلیمی ماحول اور وسائل تعلیم کے تصور میں جو تبدیلی آئی ہے وہ اس طرح ہے:

- زبان ایک نظام ہے۔
- زبان کی تعلیم غیر شعوری عمل ہے۔
- زبان کی تعلیم کل سے جزو کی طرف ہوتی ہے۔
- پیدائشی طور پر ہر بچے کے ذہن میں زبان کا ایک خاکہ موجود رہتا ہے جو کسی خاص زبان کا نہیں ہے۔
- بچہ ماحول اور مواقع کے زیر اثر مختلف تجربات سے زبان سیکھتا ہے۔
- زبان کی تعلیم محض ایک ٹیکسٹ کی بنیاد پر نہیں بلکہ سماج کے پیدا کردہ Dynamic Text سے ہوتی ہے۔
- جدید طریقۂ کار میں بچوں کو مرکزیت حاصل ہے۔
- تعلیمی سرگرمیاں عمل و حرکات پر زور دینے والی ہوں۔
- طریقۂ تدریس مفہوم سے الفاظ کی طرف لانے والا ہو۔
- سرگرمیاں ایسی ہوں جو غیر شعوری طور پر تعلیم کی ترغیب دیں۔
- طریقۂ تدریس تخلیقی صلاحیت کو ابھارنے والا ہو۔
- زبان کی تعلیم میں کام آنے والی تمام چیزوں میں درسی کتاب ان میں سے ایک ہے۔
- کتاب کسی تعلیمی سرگرمی کے ذریعے تیار کی گئی ہو۔
- جن چیزوں کا بیان ہو وہ بچوں کے لیے مانوس ہوں۔
- بچہ اور بچہ، استاد اور بچہ، بچہ اور سماج کے میل جول کو مدنظر رکھا جائے۔
- جملہ چیزیں بچوں کے استعمال کے لائق ہوں۔
- تعلیمی ماحول بچوں کی فطرت کے مطابق ہو۔

ریاست میں پانچویں سے بارھویں جماعت تک پڑھائی جانے والی کتابیں وگوڑسکی، چوم سکی، وغیرہ ماہرین لسانیات و تعلیمات کے نفسیاتی اور فلسفیانہ نظریات کی بنیاد پر تیار کی گئی ہیں۔ بچوں کی عمر اور نفسیات اور فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ موجودہ نصاب خود آموزی پر زور دیتا ہے، گروپ ورک کے ذریعے سرگرمیاں عمل میں لانے سے بچوں میں سماج میں جینے کی سمجھ بھی پیدا ہوتی ہے۔

اردو زبان کی تعلیم کے ذریعے بچوں میں رواداری، سیکولر رواج جمہوریت، انسان دوستی، غم گساری، قومی یک جہتی، وطن کی محبت وغیرہ اقدار اور روایتوں کی نشو و نما پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ مثلاً نظم کی تدریس میں بچے مختلف طرزوں میں نظم گاتے ہیں، موزوں مصرعے بناتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر نظمیں گا کر پیش کرتے ہیں۔ نظم کے خیالات یا مفہوم پر تصویر بناتے ہیں۔ اشعار کے مفہوم یا مطلب آپس میں چرچا کر کے پیش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بچے سیمینار میں مقالے پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اردو کی مختلف تہذیبی علامات پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آٹھویں جماعت میں ایک گفتگو ہے جو غزل پر ہے۔ یہاں بچے غزل گلوکاروں کے نام سے واقف ہو جاتے ہیں اور غزل پروگرام کے لیے پوسٹر بناتے ہیں، غزل ایک ساتھ گاتے ہیں۔ نویں جماعت میں 'سرفروشی کی تمنا' ایک سبق ہے جو جنگ آزادی اور اردو کے تعلق کی یہ ایک نمائندہ کڑی ہے۔ بچے، اشفاق اللہ خاں، سکھ دیو، چندر شیکھر آزاد، بھگت سنگھ جیسے ناموں سے گروپوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اس طرح کے دیگر گیت جمع کرتے ہیں۔ خصوصی شمارہ تیار کرتے ہیں، غزل ایک ساتھ گا کر پیش کرتے ہیں جنگ آزادی پر سیمینار، کرتے ہیں، نعرے تیار کرتے ہیں اس طرح کی سرگرمیوں کو عمل میں لاتے وقت اساتذہ کو کس طرح کی ہدایتیں دیتی ہیں اس پر رہنما کتاب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

پانچویں سے بارھویں جماعت تک کی کتابوں میں، تلوک چند محروم، کنور مہیندر سنگھ بیدی، اقبال، حالی، غالب، فراق، کیفی، جاں نثار اختر وغیرہ مختلف دبستانوں اور مذاہب کے شاعروں اور ادیبوں کو شامل کیا ہے۔ جس کے تحت اردو کے سیکولر مزاج کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقدار اور رویوں میں ماحولیات کا تحفظ بھی ایک اہم جز ہے۔ شہری اور دیہاتی زندگی کے مسائل پر چھٹی اور ساتویں جماعت میں چھوٹے چھوٹے اسباق میں شہر اور گاؤں کی گفتگو، جنگل کی شکایتیں، پانی کی کمی، جنگلی جانوروں کا گاؤں میں پانی کی تلاش میں آنا جیسے موضوعات پر سرگرمیاں، قصے وغیرہ اور اسباق دلکش انداز میں پیش کیے گئے ہیں

اخلاقیات پر زور دینے والی سرگرمیاں بھی محل اور موقع کے مطابق دی گئی ہیں۔ آپ کا ایک دوست بیمار پڑا ہے۔ اس کی تیمارداری کے لیے آپ جاتے ہیں تو کن الفاظ میں اس کو تسلی دیں گے۔ اگر راستے میں ایک مریض کو پڑا پایا تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اسی طرح مختلف سوالات کی مدد سے بچوں کی شخصیت کو ابھارا جاتا ہے، سنوارا جاتا ہے اور وہ جمہوری ہندوستان کے ایک ذمہ دار شہری بننے کے ساتھ ساتھ زبان اردو میں اظہار خیال بھی کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ نظریاتی طور پر مذکورہ بالا باتیں بہت سی امید افزا ثابت ہوئی ہیں اور سرکار بھی اردو کا حق دینے کے لیے آمادہ ہے۔

حالانکہ ریاست کی اپنی چند تحدیدات بھی ہیں مثلاً

- ایک زبانی ماحول پیدا کرنے میں ناکامی۔
- بچوں کے ادب، رسالوں۔ اور کتابوں کی فراہمی اور دستیابی کا معاملہ۔
- اردو کلچر سے ناآشنائی۔
- غیر تربیت یافتہ پرائمری اساتذہ کے مسائل۔
- اردو داں ماہرین تعلیمات ولسانیات کی کمیابی۔
- تعلیم وتدریس کو مزید آسان اور دلکش بنانے کے لیے اطلاعاتی ٹکنالوجی کے استعمال کرنے کی سہولت کی عدم موجودگی۔
- اردو دوست اداروں، اردو اکادمیوں سے مل کر کام کرنے، اور تعاون کے مواقع کی کمی۔

پھر بھی ہمیں امید ہے کہ 2007 میں جب دوبارہ نصاب کی تشکیل و تجدید ہوگی تو ان باتوں پر غور کرنے کا موقع ملے گا۔ □□□

پتہ:
R. O. (Urdu)
SCERT - Thiruvananthapuram-12
KERALA

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاص وطن کی لڑائی پورے جوش وخروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت: -/300 روپے

آندھی (منظرنامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظرنامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایسا سلسلہ کہا جاسکتا ہے جو کہانی کا روپ دھارن کرلے۔ فلم "آندھی" کا یہ منظرنامہ کملیشور کے ناول "کالی آندھی" پر مبنی ہے اور اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور گیت گلزار کے قلم سے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ مجموعی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا لیکن اس کی اشاعت کا ایک مقصد ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی بھی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کے خواہش مند ہیں۔

صفحات: 122، قیمت: -/65 روپے

تاریخ اور سماجیات

مصنف: عائشہ بیگم

تاریخ اور سماجیات، علم کے دو مختلف گوشے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ کا سب سے قریبی تعلق سماجیات سے ہے کیونکہ دونوں کا موضوع انسان، اس کا طرز عمل اور کردار ہیں۔ انسانی کردار کی داستان اس کے اخلاق وعمل اور آپسی تعلقات کی داستان ہے اور اخلاق وعمل کا انحصار بڑی حد تک ماضی کے تجربات پر بھی ہوتا ہے۔۔۔ اس کتاب میں اس اہم بحث کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ طرز بیان استدلالی اور علمی ہے۔

صفحات: 140، قیمت: 51 روپے

جدید سیاسی فکر

مصنف: ڈاکٹر سید انوارالحق حقی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

اس کتاب میں جدید سیاسی فکر کے پس منظر کے ساتھ ساتھ ان تمام سیاسی فلسفوں پر گفتگو کی گئی ہے جنھوں نے اس مدت میں عالمی سیاست پر اثر ڈالا اور مختلف حکومتی نظاموں کی تشکیل یا استرداد دونوں کا موجب بنے۔ قدامت پسندی، افادہ پسندی، عینیت، ثنویت، قانونیت، اشتراکیت اور اس کے مختلف مکاتب فکر، سیاسی تکثیریت، مملکت مخالف نظریات، جمہوریت مخالف نظریات، مہاتما گاندھی کا عدم تشدد کا نظریہ اور سرودیہ تحریک۔۔۔ یہ کتاب ان تمام عنوانات پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے۔

صفحات: 305، قیمت: -/120 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

الطاف انجم

ریاست جموں و کشمیر میں اردو تعلیم

عہدِ عتیق سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک کشمیر میں درس و تدریس کی زبان سنسکرت تھی لیکن اسی صدی کے اخیر میں فارسی علما اور فضلا کی آمد کی وجہ سے یہاں کے تعلیمی، مذہبی اور سماجی اداروں میں فارسی زبان کا عمل دخل شروع ہوا اور کچھ ہی مدت میں فارسی کی رسائی سرکاری ایوانوں تک بھی ہوگئی۔ چونکہ زبان اپنی فصاحت و بلاغت اور دوسرے لسانی اور جمالیاتی خصائص کی بنا پر ممتاز مقام رکھتی تھی اس لیے کشمیر کے پیاسے تخلیقی ذہنوں کو اس نے بہت جلد اپنی طرف راغب کرلیا۔ فارسی محاورے اور فقرے عوام کی زبان پر جاری ہونے لگے۔ فارسی زبان کی اسی مقبولیت کی بنا پر انیسویں صدی میں کشمیر کو ''ایرانِ صغیر'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں کشمیر زبردست سیاسی اور سماجی تبدیلی سے دوچار ہوا جو ایک لسانی تبدیلی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوا اور اردو زبان، جو کشمیر کے باہر اپنی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا لوہا منوا چکی تھی یہاں بھی اپنی جگہ بنانے لگی۔ 1885 میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اردو کو کشمیر کی سرکاری زبان کے منصب پر فائز کردیا اور یہاں سارے سرکاری محکموں میں اردو رائج ہوگئی اور تمام سرکاری کام اردو میں ہونے لگے۔ برصغیر میں آزادی کا سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی کچھ ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں جنھوں نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ تعلیمی منظرنامہ بھی بدلا۔ اردو مسلمانوں سے اور مسلمان اردو سے منسوب کیے جانے لگے۔ اس کے باوجود کشمیر میں اردو زبان کا دائرۂ اثر کچھ زیادہ کم نہیں ہوا۔ کشمیر سے باہر انگریزی زبان کے طوفان نے دوسری مقامی اور علاقائی زبانوں پر فوقیت حاصل کی لیکن یہاں بہت حد تک اردو تعلیم کی صورت حال اطمینان بخش ہے۔

کشمیر میں اردو کو آج بھی ریاست کی سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل ہے نیز ریاست کے مختلف خطوں کے درمیان رابطے کی زبان ہونے کا اعزاز بھی اسے حاصل ہے، یہاں کے محکمۂ مال، عدلیہ، پولیس، صحافت، کاروباری کھاتوں اور روزمرہ کے دوسرے کاموں میں اردو ہی مستعمل ہے۔

صوبۂ جموں و کشمیر میں ابتدائی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک اردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے۔ یہاں 2000 تک ابتدائی جماعت سے آٹھویں جماعت تک اردو ذریعۂ تعلیم تھی اور اس کے بعد سے یونیورسٹی کی سطح تک اردو کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے، محکمۂ تعلیم کے اعداد و شمار (2005-2006) کے مطابق ثانوی اور اعلیٰ سطح کی تعلیم کے درجات میں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہورہا ہے۔ محکمے کے اس دعویٰ کا معترف یہ احقر بھی ہے کیونکہ جب میں ایم.اے. کے داخلہ امتحان کے لیے کشمیر یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوا تو وہاں اردو میں داخلہ لینے والے طلبہ کی کل تعداد 819 دیکھ کر میرا یقین اور بھی راسخ ہوگیا کہ اردو نئی نسلوں میں بھی اپنی جگہ بنا رہی ہے۔

واضح رہے کہ کشمیر یونیورسٹی میں ایم.اے. اردو کے لیے کل 65 نشستیں مختص ہوتی ہیں اس طرح خواہش مند امیدواروں اور کل نشستوں کے درمیان تناسب کو سمجھا جاسکتا ہے۔ کالجوں میں صورت حال یہ ہے کہ لگ بھگ ہر چار طلبہ میں سے ایک اردو کا طالب علم ہوتا ہے۔ اردو کی امید افزا صورت حال کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ 2006 میں اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں اردو لکچراروں کی خالی اسامیاں پُر کرنے کے لیے ریاستی پبلک سروس کمیشن نے 118 نشستوں کے لیے درخواستیں طلب کیں جبکہ انگریزی جیسی عالمی زبان کے لیے یہ تعداد 130 تھی۔ صوبہ جموں و کشمیر میں اعلیٰ ثانوی تعلیم کے لگ بھگ 210 اسکول (دسمبر 2006 تک) طالبانِ علم کو علم کے نور سے بہرہ مند رہے ہیں۔ ان تمام اسکولوں میں اردو کا کم سے کم ایک لکچرار ضرور مقرر ہے۔ بعض جگہوں پر طلبہ کی کثیر تعداد کی وجہ سے لکچراروں کی تعداد دو یا اس سے زیادہ بھی ہے۔ تادمِ تحریر 35 ڈگری کالج اور 152 بی.ایڈ. کالج کشمیر یونیورسٹی سے منظور شدہ ہیں۔ ہر ڈگری کالج اور بی.ایڈ. کالج میں بالترتیب 3-4 اور 1-2 لکچرار اردو کے برسرکار ہیں۔ اردو کے حوالے سے یہ بات محیر العقول معلوم ہوتی ہے کہ سماجی علوم اور بعض سائنسی مضامین سے سند یافتہ لوگوں کے مقابلے میں اردو زبان سے فارغ التحصیل امیدوار کو روزگار کے بہتر مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ فاصلاتی نظامِ تعلیم اور شعبۂ اردو سے بالترتیب 500 اور 65 لوگوں کے فارغ التحصیل ہونے کے باوجود سینکڑوں طلبہ داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے ناامید اور مایوس ہوجاتے ہیں۔

اس کے علاوہ 2006-2007 کے تعلیمی سال میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدرآباد) کے فاصلاتی نظامِ تعلیم کے تحت بھی 710 خواہشمندوں نے ایم.اے. اردو میں داخلہ لیا ہے۔ نیز اردو یونیورسٹی کے

فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت ہی 312 امیدوار اردو میڈیم سے تاریخ میں ایم.اے. کررہے ہیں۔ اسی طرح بی.اے. اور بی.ایس.سی. میں بھی بالترتیب 809 اور 49 امیدواروں کا اندراج ہوا ہے۔

دانش گاہ کشمیر کے شعبۂ اردو اور شعبۂ فاصلاتی نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ ادارۂ اقبالیات بھی، جو اقبال کے فکروفن کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق وتنقید کا کام کررہا ہے، اردو کی خدمت میں سرگرم ہے۔ علاوہ ازیں جموں وکشمیر کلچرل اکادمی بھی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو اور اردو والوں کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہتی ہے نیز بیسیوں ادبی اور ثقافتی انجمنیں مشاعروں، مذاکروں اور دیگر ادبی مجلسوں کے ذریعے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ لسانی اعتبار سے اردو زبان کی ساخت کشمیر کی مقامی زبانوں اور بولیوں سے مشابہت رکھتی ہے جیسے کشمیری، گوجری، پہاڑی، شینا، وردی اور بلتی وغیرہ زبانوں کا رسم الخط اردو رسم الخط سے مشابہ ہے اور یہ زبانیں اردو کی ہم عمر بھی ہیں۔ اردو زبان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہ جموں وکشمیر ریاست کے جغرافیائی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی لحاظ سے مختلف خطوں کے درمیان لنگوا فرنکا کی حیثیت حاصل کرچکی ہے جو اس کے روشن مستقبل کی واضح دلیل ہے۔

اردو زبان کی تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے ساتھ ساتھ کشمیر میں بھی قابلِ تحسین اقدام کیے ہیں۔ اس نے ہر ضلع اور تحصیل کی سطح پر کمپیوٹر مراکز کھولے ہیں جو اردو طلبہ اور دوسرے محبانِ اردو کو Cyberage میں اپنی حیثیت منوانے میں قابلِ ستائش کردار ادا کررہے ہیں۔ یہاں کے مختلف مراکز میں قومی اردو کونسل درج ذیل کورسز کراتی ہے۔

1. One Year Computer Diploma in DTP and Multilingual.
2. Certificate in Functional Arabic.
3. Diploma in Funcional Arabic (One/two year).
4. Diploma in Urdu Language.

قومی اردو کونسل کے ان اقدامات کو اربابِ فکر ایک مستحسن عمل ٹھہراتے ہیں۔ مستقبل میں اردو زبان کی ترقی کے حوالے سے قومی اردو کونسل کے ساتھ بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ قومی اردو کونسل کی ان کوششوں سے اردو سے وابستہ طلبہ وطالبات احساسِ کمتری کو خیرباد کہہ رہے ہیں اور انھیں روزگار کے بہتر مواقع حاصل ہورہے ہیں۔

ریاستی سرکار نے ماضی قریب میں پہلی سے آٹھویں تک انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بناکر اردو زبان اور اس کے بولنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے جس کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ ریاست جموں وکشمیر ملک کی وہ واحد ریاست ہے جہاں عوام اور خواص دونوں نے اردو کو اپنایا، اور یہ صوبے کی ہر دلعزیز زبان ہے۔ ملک کی ایسی ریاستوں میں اردو اکادمیاں موجود ہیں جہاں اردو کی وہ حیثیت نہیں جو اس صوبے میں ہے لیکن کشمیر میں آج تک اردو اکادمی قائم نہیں ہوئی۔ اسی طرح صحافت کا شعبہ بھی سرکار کی بے توجہی کا شاکی ہے۔ ضرورت ہے کہ اربابِ اقتدار ان امور پر توجہ دیں۔

□□□

پتہ:
Alamdar Basti
Charare Shareef-191112(J&K)

ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد اوّل)

مصنف: چارلس ڈکنس/مترجم: فضل حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشاپردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔ اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ (یوسف ناظم)

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد عبدالقدیر

اتر پردیش میں اردو بحیثیت دوسری سرکاری زبان

26 جنوری 1950 کو ہندوستان کا آئین نافذ ہوا۔ اس کی دفعہ 29(1) میں تمام ہندوستانیوں کو اپنی زبان، رسم الخط اور تہذیب کی حفاظت کا حق دیا گیا۔ دفعہ 29 اور 30 میں اقلیتوں کو لسانی اور تہذیبی حقوق اور تعلیمی اداروں کے تحفظ، ان کے قیام، انتظام و انصرام کے حقوق بحق اقلیت محفوظ رہنے کی ضمانت دی گئی۔ دفعہ 345 میں تمام صوبائی حکومتوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ سرکاری کام کاج کی زبان کا تعین خود کریں۔ اس دفعہ میں دیے گئے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اتر پردیش کی اسمبلی نے اتر پردیش آفیشیل لینگویج ایکٹ (U.P. Officail Language Act 1951) میں پاس کیا جس کے ذریعے ہندی زبان کو دیوناگری رسم الخط میں صوبے کی سرکاری زبان بنایا گیا۔

صوبۂ بہار نے 1950 میں اپنا آفیشیل لینگویج ایکٹ پاس کیا اور ہندی کو اپنے سرکاری کام کاج کی زبان بنایا۔ 1981 میں جگن ناتھ مشرا جی کی حکومت نے مذکورہ ایکٹ 1950ء میں چھوٹی سی ترمیم کے ذریعے مندرجۂ ذیل امور کے لیے اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا:

1- اردو میں عرضیوں اور درخواستوں کو قبول کرنا اور ان کا جواب اردو میں دینا
2- اردو میں تحریر شدہ دستاویزوں کو رجسٹریشن آفس میں قبول کیا جانا
3- اہم سرکاری قاعدوں، ضابطوں، نوٹیفکیشن کی اردو میں اشاعت
4- عوامی حیثیت کے سرکاری احکامات، گشتی مراسلوں (سرکلر) کو اردو میں جاری کیا جانا
5- اہم سرکاری اشتہارات کی اردو میں بھی اشاعت
6- اہم سائن بورڈوں میں اردو کا استعمال

بہار حکومت کے مذکورہ قانون کو بنیاد بنا کر کانگریس کی نرائن دت تیواری حکومت نے اتر پردیش آفیشیل لینگویج ایکٹ نمبر 8، 1989 پاس کیا جس کے ذریعے اتر پردیش آفیشیل لینگویج ایکٹ 1951 میں ترمیم کر کے دفعہ 2 کے بعد مندرجۂ ذیل دفعہ 3 کا اضافہ کیا۔

دفعہ 3۔ اردو بولنے والے لوگوں کے فائدے کے لیے اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے ایسے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا جو وقتاً فوقتاً حکومت بذریعۂ نوٹیفکیشن مقرر کرے۔

اس ترمیم کی وضاحت میں لکھا گیا ہے کہ چونکہ صوبۂ بہار میں اس طرح کا قانون نافذ ہے اور کامیابی سے چل رہا ہے لہٰذا اردو عوام کے مفاد میں یہ ترمیم کی جاتی ہے۔ اس ترمیمی قانون کا نفاذ 16-10-1989 کے نوٹیفکیشن کے ذریعے عمل میں لایا گیا۔ اس کے دوسرے دن یعنی 17 اکتوبر 1989 کو نوٹیفکیشن نمبر 417/21/89 کے ذریعے اردو کو بطور دوسری سرکاری زبان صوبے میں مندرجۂ ذیل امور کے لیے تسلیم کیا گیا۔

1- اردو میں عرضیوں اور درخواستوں کو قبول کرنا اور ان کا جواب اردو میں دینا
2- اردو میں تحریر شدہ دستاویزوں کو رجسٹریشن دفتر میں قبول کرنا
3- اہم سرکاری ضابطوں اور حکم ناموں کو اردو میں شائع کرنا
4- عوامی اہمیت کے سرکاری احکامات، گشتی مراسلوں کو اردو میں بھی جاری کرنا
5- اہم سرکاری اشتہارات کا اردو میں بھی شائع کیا جانا
6- سرکاری گزٹ کی اردو میں بھی اشاعت
7- اہم سرکاری سائن بورڈ اردو میں بھی ہونا

اس طرح نمبر 6 کے علاوہ بہار کے نوٹیفکیشن کی ہو بہو نقل کر دی گئی۔ نہ خود کوئی نئی بات سوچی نہ خاطر خواہ اضافہ کیا۔ مذکورہ بالا قانون کے نفاذ کے لیے حکومت نے 19 نومبر 1990 کو ایک اعلانیہ جاری کیا جس کے ذریعے مذکورہ قانون کا نفاذ کیا گیا۔

اس قانون کو عملی جامہ پہنانے کے لیے 1994 میں اعلانیہ نمبر 80C/M/77Ka/4-94 جاری ہوا جس کے ذریعے حکومت کے تمام شعبوں یہاں تک کہ وہ وکاس کھنڈ کے دفاتر میں بھی اردو مترجم کا عہدہ قائم کرنے اور اس پر تقرریاں کرنے کا حکم صادر کیا گیا لیکن اس حکم پر کسی بھی حکومت نے سنجیدگی سے آج تک عمل نہیں کیا۔

اتر پردیش میں اردو پوری طرح سرکاری زبان نہیں ہے بلکہ بہت محدود معنی میں یہ دوسری سرکاری زبان ہے۔ نیز جن امور کے لیے یہ سرکاری زبان ہے ان میں بھی ''اہم'' اور ''عوامی اہمیت'' کی شرط لگا کر حکومت کے اہلکاران کے اختیار مجازی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جہاں چاہیں اطلاق کریں اور جہاں نہ چاہیں نہ کریں۔ اردو کی ایک بہی خواہ انجمن اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں ایک رٹ دائر کی کہ حکومت کو یہ ہدایت دی جائے کہ وہ مذکورہ بالا امور میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرے۔ رٹ دائر ہونے کی وجہ جناب ملائم سنگھ کی حکومت کے ایک اعلیٰ افسر نے جوابی حلف نامہ (Counter Affidavit) داخل کیا اور یہ کہا کہ حکومت ان امور میں اردو کا استعمال پوری طرح سے کر رہی ہے جن کے لیے یہ دوسری سرکاری زبان ہے۔ ہائی کورٹ نے یہ کہہ کر رٹ خارج کر دی کہ رٹ کنندہ کوئی ثبوت نہیں دے پایا کہ کن امور پر حکومت عمل نہیں کر رہی ہے، لیکن

حکومت کو یہ ہدایت ہائی کورٹ نے ضرور دی کہ حکومت ان سات نکات پر اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے۔ اس فیصلے سے صوبائی حکومت کی جھوٹ کو سند مل گئی اور اسے شہ بھی مل گئی کہ وہ جو کر رہی ہے وہ درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان امور کے لیے بھی موجودہ حکومت اردو کا استعمال نہیں کر رہی ہے جن کے لیے صوبے میں اردو سرکاری زبان ہے۔

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جیسے ہی سماج وادی پارٹی برسراقتدار آئی، اس نے اعلان کیا کہ سرکاری دفاتر میں اردو کے بورڈ لگیں گے اب صورت حال یہ ہے کہ کچھ دفتروں میں آپ کو اردو کے بورڈ ضرور مل جائیں گے لیکن ان میں الفاظ ہندی کے ہی ہوں گے، صرف رسم الخط اردو کا ہوگا اور وہ رسم الخط کسی اناڑی کا لکھا ہوا ایسا ہوگا کہ دیکھتے ہی آپ کو کراہیت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا یہ اس حکومت کا اردو کے ساتھ رویہ ہے جو بظاہر اردو والوں کی ہمدرد مانی جاتی ہے۔ اس طرح اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کہنا ایک واہمہ زیادہ اور حقیقت کم ہے۔ جب تک اردو کو حکومت کے کام کاج میں استعمال ہونے والی زبان نہ بنایا جائے گا تب تک ایسے اعلانات سے جن کی بنیاد پر اردو کے دوسری سرکاری زبان ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، اردو کا کچھ بھلا نہیں ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اردو والے جن کا اہم رول اتر پردیش کی سیاست میں ہے حکومت کو مجبور کریں کہ وہ از سر نو اعلانیہ جاری کرے اور ایسے امور کو اردو میں کام کاج کرنے کے لیے شامل کرے جن سے اردو کی تعلیم اور اردو کے استعمال کی عملی شکل پیدا ہو۔

اس کے علاوہ اہم بات یہ ہے کہ محض سرکلر اور نوٹیفکیشن جاری کرنے سے اردو دوسری سرکاری زبان از خود نہیں بن جاتی۔ خود اردو والے اس کا استعمال کتنا اور کس حد تک کرتے ہیں۔ مثلاً آپ اپنے شہر اور قصبے کا جائزہ لیں کہ ایک ماہ میں کتنے لوگ، کتنے محکموں میں اردو میں درخواستیں دیتے ہیں۔ میں مقامی کریلی تھانہ الٰہ آباد کا حوالہ دے سکتا ہوں جہاں ایک اردو مترجم مقرر ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ لوگ اردو میں درخواستیں ہی نہیں لاتے لہٰذا ان سے آفس میں ہندی کا کام لیا جاتا ہے۔

اردو میں بیع ناموں کے رجسٹریشن کرانے کا قانون ہے مگر مجھے معلوم ہوا ہے کہ الٰہ آباد کے رجسٹریشن آفس میں اب کوئی صاحب اردو میں دستاویز برائے رجسٹریشن نہ داخل کرتے ہیں اور نہ اردو کے وثیقہ نویس ملیں گے جو اردو میں بیع نامے لکھتے تھے، یا تو وہ دکان بڑھا گئے یا ہندی سے رجوع کر چکے ہیں۔ سرکاری گزٹ جو اردو میں شائع ہوتے ہیں، کتنے اردو داں حضرات یا اردو کے ادارے خریدتے ہیں؟ اردو کے اخبارات کو کل اشتہارات کا بیس فیصد ملتا ہے، اخبار کے مالکان یا مدیران اس میں کتنا حصہ اردو کی ترویج و اشاعت میں صرف کرتے ہیں؟ بہت سے موقر اخبارات و رسائل اردو کے ہیں لیکن ہندی اور انگریزی میں سرکاری اور غیر سرکاری اشتہارات شائع کرتے ہیں۔ کیا وہ یہ شرط لگا کر اشتہار واپس کر سکتے ہیں کہ ہم اشتہار صرف اردو میں شائع کریں گے؟ اگر ایسا کریں گے تو ان کا مالی نقصان ہوگا۔ وہ اخبار بزنس کے لیے چلا رہے ہیں یا اردو کے کاز کے لیے؟ یہ درست ہے کہ سارے اخبارات یا رسائل ایسے نہیں ہیں، کچھ مدیر ایسے بھی ہیں جو اردو زبان کے لیے اپنا خون بھی جلاتے ہیں اور اپنی گاڑھی کمائی کا پیسہ صرف کرکے خسارے میں بھی اخبارات و رسائل جاری رکھتے ہیں۔

آئین ہند کی دفعہ 208 کے مطابق صوبائی اسمبلیاں اپنے کام کاج کی زبان اختیار کرنے کی مجاز ہیں۔ اس کے تحت اتر پردیش اسمبلی نے 1958 میں اپنے ضابطے بنائے ہیں۔ اس کے ضابطہ نمبر 282 میں تحریر ہے کہ:

"282۔ سبھا کی بھاشا: آئین کی دفعات کے مطابق سبھا کا کام ہندی بھاشا دیوناگری رسم الخط میں ہوگا۔''

اس کے علاوہ اسپیکر کے احکامات بھی قانونی حیثیت کے حامل ہیں جس کا ہدایت نامہ (Direction)، نمبر 161 کہتا ہے کہ:

''ودھان سبھا کے کام کاج کی بھاشا اور رسم الخط ہندی دیوناگری ہے۔ جب تک یہ قانون ہے تب تک ودھان سبھا سکریٹریٹ میں دوسری کسی زبان کے رسم الخط میں کام نہ کیا جائے گا اور نہ کسی دوسری زبان یا رسم الخط میں موصول شدہ درخواستوں پر عمل درآمد ہوگا۔ یہ حکم اتر پردیش کے باشندوں کی درخواستوں کے بارے میں بھی لاگو ہوگا۔'' یہ ہدایت نامہ آئین ہند کی دفعہ 350 کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

کانگریسی حکومتوں کے اوائل میں شیخ نفیس الحسن اور 1984 کے نصف سے 1989 کے نصف تک پورے پانچ سال نیاز حسن خاں صاحب اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ سماجوادی پارٹی کی حکومت 2003 میں بننے کے بعد ڈاکٹر وقار احمد شاہ ڈپٹی اسپیکر اور 2004 میں قائم مقام اسپیکر ہوئے۔ یہ لوگ چاہتے تو گذشتہ ہدایت نامہ نمبر ایک سو اکسٹھ (161) میں ترمیم یا اضافہ کر دیتے اور اسمبلی میں اردو کے استعمال کی اجازت دے دیتے لیکن ایسا نہ ہوا۔ تیرھویں اسمبلی میں اعظم گڑھ کے جناب عالم بدیع صاحب چن کر گئے تو انھوں نے اور ایک اور رکن اسمبلی نے اردو میں حلف لینے کی مانگ کی لیکن اس وقت کے بی۔جے۔پی۔ کے اسپیکر پنڈت کیسری ناتھ ترپاٹھی اڑ گئے اور انھیں اردو میں حلف لینے کی اجازت نہ دی۔ جب ان کے حلف لینے کی میعاد نکلنے کو ہوئی تو اپنی رکنیت بچانے کے لیے ان دونوں حضرات نے ہندی میں ہی حلف لیا۔

حکومت اتر پردیش نے آئین کی دفعہ 309 کے تحت ''اتر پردیش مقابلہ جاتی امتحان'' (تحریری امتحان کا میڈیم) [U.P. Competitive Examination (Medium of Written Exam.) Role 1994] قانون مجریہ 1994 جاری کیا جس میں ملازمت کے لیے منعقدہ کسی بھی امتحان یا پبلک سروس کمیشن اتر پردیش کے ذریعے منعقدہ ملازمتی امتحانات میں کوئی بھی امیدوار انگریزی (رومن رسم الخط) یا ہندی (دیوناگری رسم الخط)

یا اردو (فارسی رسم الخط) میں امتحان دے سکتا ہے۔ لیکن امتحان کے پرچے صرف انگریزی یا ہندی میں ہوں گے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قانون کی دفعہ 4 میں ترمیم کا مطالبہ کیا جائے کہ جب مذکورہ تین زبانوں میں پرچوں کا جواب دیا جاسکتا ہے تو پرچہ اردو زبان میں کیوں نہیں ہوگا، صرف انگریزی اور ہندی میں کیوں؟

اس کے علاوہ یو۔ پی۔ پبلک سروس کمیشن الہ آباد نے 1-1-2004 کو ایک اشتہار جاری کیا۔ Combined Provincial/Subordinate Services Preliminary Exam 2000 (مشترکہ صوبائی/ماتحت ملازمت ابتدائی امتحان 2000) جس کے پیراگراف 4 میں یہ لکھا تھا کہ جو لوگ انگریزی یا ہندی میں جواب لکھیں گے انھیں ترجیح دی جائے گی۔ اس کے خلاف الہ آباد کی اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے ایک مراسلہ صدر جمہوریۂ ہند کو روانہ کیا جنھوں نے اسے اپنے خط 16-5-2000 کے ذریعے حکومت اترپردیش کے چیف سکریٹری کو برائے احکام روانہ کردیا۔ جب اس پر کارروائی نہ ہوئی تو مذکورہ آرگنائزیشن نے اس کے خلاف الہ آباد ہائی کورٹ میں رٹ نمبر 27894/2000 دائر کی جس پر یو. پی. پبلک سروس کمیشن نے آئندہ امتحانات میں ایسا نہ کرنے کا بیان دیا لیکن ہائی کورٹ نے 10 ستمبر 2002 کو اس رٹ کو یہ کہہ کر خارج کردیا کہ:

1- اردو تمام مقاصد کے لیے یو. پی. کی دوسری سرکاری زبان نہیں ہے بلکہ مذکورہ بالا سات باتوں کے لیے ہے۔

2- چونکہ 1994 کے مذکورہ رولس میں اردو زبان میں پرچے بنانے کا قانون نہیں ہے لہٰذا کمیشن کو پابند نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایسا کرے اور ایسا نہ کرکے کمیشن نے کوئی قانونی غلطی نہیں کی اور نہ ہی کسی امتیازی سلوک کا ارتکاب کیا ہے۔

3- کمیشن نے خود ہی فائنل امتحان میں پیراگراف 4 پر عمل درآمد نہ کرنے کو کہا ہے اس لیے عدالت اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں دے رہی ہے۔

ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن الہ آباد نے سپریم کورٹ میں اسپیشل اپیل داخل کی ہے جو ہنوز زیر سماعت ہے۔

اس طرح مقننہ (Legislative) اردو کو سرکاری کام کاج یا روزی روٹی سے جوڑنے والی زبان بنانے کو تیار نہیں ہے بھلے ہی کسی سیاسی جماعت کی حکومت ہو۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک حال ہے اس کی عاملہ (Executive) کا یعنی حکومت کے اہلکاران یا مشینری جو نفاذ پر مامور ہے۔ وہ ان سات امور میں بھی اردو کا استعمال نہیں ہونے دیتے جن کے لیے اسے دوسری سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

اب ذرا ایک نظر عدلیہ پر بھی ڈال لی جائے۔ ابتدائی عدالتوں میں آج بھی عدلیہ (Judiciary) میں اردو کے الفاظ کے بغیر کام نہیں چلتا۔ فارسی کے بعد اردو کا ہی چلن تھا۔ یو۔ پی۔ (North West Province) کے گورنر میکڈانلڈ نے پہلی بار 1900 میں عدالتوں میں اردو کے ساتھ ہندی کے استعمال کی اجازت دی تھی۔ ہندی کے صوبائی زبان ہونے کے باوجود جب 1951 میں یو. پی. جوڈیشیل سروس رولس بنائے گئے تو ابتدائی عدالت جو منصفی کہلاتی تھی جس کے لیے منصف کا تقرر بذریعۂ مقابلہ جاتی امتحان ہوتا ہے جو یو. پی. پبلک سروس کمیشن منعقد کرتا ہے۔ یہ امتحان منصفی یا پی-سی-ایس (جے) [Provicial Civil Service (Judicial)] کہلاتا ہے۔ اس میں سو (100) نمبر کا ایک پرچہ زبان (language) کا ہوتا ہے جس میں 40 نمبروں کا اردو کا نصاب ہوتا تھا جس میں اردو سے ہندی اور انگریزی میں ترجمہ اور اس کا الٹا اور ہندی رسم الخط سے اردو رسم الخط میں منتقلی (Transliteration) ہوتا تھا۔ اس سے اردو جاننے والوں کو اس پرچے سے مدد ملتی تھی اور اردو نہ جاننے والے طلبہ بھی اس پرچہ کے لیے اردو پڑھتے تھے۔ سنہ 1996/1995 میں جسٹس ایس.ایس. سودھی کو پنجاب ہائی کورٹ سے منتقل کرکے الہ آباد ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد وہ یہاں کے چیف جسٹس ہوگئے۔ انھوں نے منصفی کے عہدے کا نام سول جج جونیئر ڈویژن (جیسا پنجاب میں تھا) رکھنے کی تجویز رکھی اور الہ آباد ہائی کورٹ کے ججوں نے اس کو منظور کردیا۔ لہٰذا پہلے تو عہدے کا نام بدلا اور پھر یو. پی. جوڈیشیل سروس رولس 2001 نافذ کرکے 1951 کے رولس میں تبدیلی کردی گئی جس کے ذریعے 40 نمبروں کا اردو کا پرچہ بالکل ختم کردیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اردو والوں نے حکومت کے اس عمل کا نوٹس لیا یا کوئی احتجاج کیا؟ جواب ہوگا نہیں۔

صوبۂ اترپردیش میں جہاں تک اردو کے سرکاری سطح پر استعمال کیے جانے کا مسئلہ ہے اس کو مناسب حکمت عملی سے ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جن سات امور کے لیے اردو کو سرکاری زبان تسلیم کیا گیا ہے پہلے سرکاری عملہ ان پر نیک نیتی سے عمل درآمد کرائے ساتھ ہی اردو والے بھی ان امور کو روبہ عمل لانے میں اپنی ذمہ داری نباہیں اور خود اردو کا استعمال کریں۔ اس کے بعد حکومت ان قوانین اور احکامات میں جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، خاطر خواہ ترمیم کرے اور ہر محکمے میں اردو جاننے والوں کی تقرری کرے کہ قوت نفاذ کے بغیر محض قانون بنا دینے سے کوئی زبان ترقی کی منزلیں طے نہیں کرسکتی۔ اردو کی خدمت صرف ادب سازی ہی نہیں زبان کی بقا اور اس کا تحفظ بھی ہے۔ کسی زبان کے ارتقا یا زوال میں حکومتوں اور حکمرانوں سے زیادہ رول خود اس زبان والوں کا ہوتا ہے۔ کیا ہم اپنی مادری زبان کی حفاظت کے لیے واقعی سنجیدہ ہیں؟

□□□

پتہ:
D-909, Kareli Colony, Allahabad-211016 (U.P.)

محمد حسن فاروقی

اسکول لائبریری

علم کے حصول کا اہم ترین ذریعہ مطالعہ ہے۔ جس طرح انسانی جسم کی بقا اور اس کی صحت کے لیے مادی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح مطالعہ زندگی سے بھرپور ذہنوں اور قلوب کی غذا ہے۔ انسان کا علم اور اس کا فکری ارتقا اسی مطالعہ پر موقوف ہے۔ جب سے انسان نے اپنے خیالات اور تصورات کو کاغذ پر منتقل کرنا شروع کیا۔ اسی روز سے لائبریری کی اہمیت بڑھتی گئی۔ موجودہ دور میں بھی لائبریری ہماری علمی اور تہذیبی زندگی کی روح سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا پہیہ ہے جس نے ہر دور میں علمی اور تحقیقی سفر کو نہ صرف رواں دواں رکھنے بلکہ تیز تر کرنے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ لائبریریوں میں محلہ، اسکول، کالج، اور یونیورسٹی کی لائبریریاں، اسپیشل ریسرچ لائبریری، حکومتی ایجنسیوں کی لائبریریاں، حکومت کے زیر انتظام خصوصی لائبریری، پبلک لائبریری اور مخطوطات کی لائبریریاں شامل ہیں۔ ان میں اسکول لائبریری دیگر تمام لائبریریوں پر فوقیت رکھتی ہے چونکہ اسکول میں تعلیم پانے والے طلبہ صرف نصابی کتابوں تک ہی محدود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی ذہنی اور علمی سطح بلند نہیں ہو پاتی۔ ایک معیاری اسکول لائبریری جہاں طلبہ میں مطالعے کا شوق پیدا کرتی ہے، ان میں علمی وسعت پیدا کرتی ہے۔ وہیں اساتذہ کے لیے بھی معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے اور انھیں درس و تدریس سے متعلق رہنما اصول فراہم کراتی ہے گویا ایک معیاری لائبریری کا قیام اسکول کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ان لائبریریوں میں چند خامیاں ایسی ہیں جنھیں قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، مثلاً: اسکول لائبریری کے نظام کی منصوبہ بندی میں غور و فکر سے کام نہیں لیا گیا ہے، لائبریری پرسکون اور دلکش جگہ پر نہیں ہے، کتابوں کے شیلف ناکافی ہیں، کتابوں کا ذخیرہ عام طور پر بے مصرف اور طلبہ کے ذوق و جستجو کے مطابق نہیں ہے اور طلبہ کی متنوع ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی، کتابیں مقفل ہوتی ہیں اور سالانہ انسپکشن کے وقت ہی ان کتابوں تک تازہ ہوا کا گزر ممکن ہوتا ہے، بعض لائبریریوں میں تربیت یافتہ لائبریرین کا تقرر نہیں کیا گیا ہے اور یہ بوجھ کسی ایسے استاد پر ڈال دیا گیا ہے جسے لائبریری کے کام سے نہ کوئی رغبت ہے اور نہ ہی شعور، بعض اسکول مالی مشکلات سے دوچار ہیں اور کتابیں خریدنے کے لیے ان کے پاس رقم نہیں ہے۔

لائبریرین کا کام کتابوں کی حفاظت کرنے، ان پر مہریں لگانے اور فہرست سازی تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ریکارڈ، ٹیپس، سی ڈی، فلم اسٹرپ، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تک پھیل گیا ہے۔ گویا اس کی ذمہ داریوں میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ لائبریرین کی چند اہم ذمہ داریاں اس طرح ہیں۔

اسکول کی ضرورت اور عام دلچسپی کے مطابق مواد جمع کرنا اور کتابوں کے انتخاب میں مناسب طریقۂ کار اختیار کرنا، لائبریری کے لیے مناسب ٹیم، عملے یا اس کام میں تعاون دینے والوں کا بہتر انتخاب کرنا، لائبریری کے لیے مختص فنڈ کا صحیح استعمال کرنا، لائبریری کے مختلف سیکشنوں میں صحیح اور مناسب تال میل پیدا کرنا وغیرہ۔ علاوہ ازیں لائبریرین کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کتابوں اور اس کا مطالعہ کرنے والوں کے درمیان مناسب رابطہ قائم کرنے کے علاوہ لائبریری کے بنیادی اصول و ضوابط کی بہر حال پابندی کرے اور لائبریری کی جدید کاری اس طرح کرے کہ لاکھوں کتابوں کی موجودگی میں بھی فوراً ہی مطلوبہ کتاب حاصل کی جا سکے۔ اسکول لائبریری میں طلبہ کی آسانی کے لیے تین قسم کے کیٹلاگ کارڈ بنائے جاتے ہیں مثلاً:

(1) باعتبار اسم کتاب (2) باعتبار مصنف (3) باعتبار موضوعات

لائبریری کو دلکش اور خوبصورت بنانے کے لیے کتابوں کی الماریاں شیشے کی ہوں۔ ان میں کتابیں اس ترتیب اور قرینے سے رکھی ہوں کہ نظریں ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ طلبہ باہر سے ہی دیکھ کر ان کی طرف متوجہ ہوں اور انھیں پڑھنے کے لیے بے چین ہو جائیں، مطالعے کا کمرہ حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق ہو۔ مثلاً کھڑکیاں ایک دوسرے کے مخالف سمت میں ہوں، روشن دان کھلے اور صاف ہوں، روشنی اور ہوا کا معقول انتظام ہو۔ کمرے کے انتظام میں موسموں کا لحاظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ لائبریری کی ہر چیز جاذب نظر اور حسن ترتیب کی مظہر ہو، لیکن یہ ظاہری حسن لائبریری کی افادیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ اسکول لائبریری کے قیام کے بنیادی مقاصد کی تکمیل ہی اسے ایک معیاری لائبریری بناتی ہے۔ اسکول لائبریری کے چند اہم مقاصد میں خاص مقصد طلبہ کے مطالعہ کو جلا دینا اور ان کو ایسی تربیت دینا ہے جس سے وہ اعلیٰ اور معیاری مواد کا انتخاب کر سکیں اور تخریبی و گمراہ کن مواد سے گریز کرتے ہوئے اپنے ذہن کو اصلاحی و تعمیری فکر سے ہم آہنگ کر سکیں، اسکول کے تعلیمی پروگرام میں موثر طریقے سے حصہ لینا اور طلبہ و طالبات کی علمی ضرورت کو پورا کرنا، طلبہ کو ایسا مواد مہیا کرنا جو ان کی شخصیت کے ارتقا اور تشکیل میں مددگار ثابت ہو۔ طلبہ کو لائبریری کے مواد کو استعمال

کرنے کی ایسی تربیت دینا کہ ان میں تمام مطبوعہ اور سمعی و بصری مواد کو اپنے طور پر استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، طلبہ اور اساتذہ کو دنیا میں ہونے والی ایجادات، تحقیقات اور واقعات سے باخبر رکھنا۔ انھیں وہ تمام کتابیں اخبارات و رسائل مہیا کرانا جن کی مدد سے وہ اندرون ملک اور بیرون ملک ہونے والے اہم واقعات اور نئی معلومات سے باخبر ہوسکیں، اساتذہ کی سہولت کے لیے جدید تدریسی تکنیک پر کتابیں اور مواد فراہم کرنا تاکہ وہ جدید سائنسی و تکنیکی طریقوں سے طلبہ کو درس دے سکیں، طلبہ کے والدین علاقے کے تعلیم یافتہ افراد کی علمی ضرورت کو پورا کرنے میں مدد دینا، علمی و تحقیقی مواد اور اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے مواد کو شائقین کی دسترس میں لانا وغیرہ۔ لائبریری سے استفادے کے لیے طلبہ میں علم کی تڑپ پیدا کرنا اور انھیں مطالعے کی ترغیب دینا بہت اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ مطالعے کی تحریک پیدا کرنے والے کئی عوامل ہیں۔ اسکول میں علمی ماحول کی افزائش کے لیے ان عوامل میں اصلاح کرنا اور تیزی لانا ضروری ہے لیکن سب سے پہلے ان معکوس عوامل کی بیخ کنی ضروری ہے جو مطالعے کی راہ میں رُکاوٹ بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر

- وقت ضائع کرنے کی عادت اور بے مصرف سرگرمیاں علمی ماحول کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔ مثلاً گھنٹوں فضول گپ شپ کرنا، کرکٹ اور دوسرے کھیلوں کے مقابلے دیکھنے کی عادت، ٹیلی ویژن کی لت، انٹرنیٹ اور سائبر کیفے میں چیٹنگ جیسی سرگرمیوں کی غیر متوازن بہتات ایسی سرگرمیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ جن طلبہ کو ان کی عادت پڑ جائے انھیں مطالعہ کی طرف راغب کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔
- بعض لوگ مطالعہ تو بہت کرتے ہیں لیکن تنظیم مطالعہ کے فقدان کے سبب اپنے مطالعے کو بامقصد نہیں بنا پاتے۔ سستا اور فحش لٹریچر پڑھنا، اخبارات کی غیر ضروری خبریں یا معلومات پڑھنے میں بہت وقت صرف کرنا، ایسی کتابیں پڑھنا جن کی کوئی افادیت نہ ہو اسی قبیل کا مطالعہ ہے۔ بے مقصد ڈرامے، افسانے، ناول، مضامین اور اشعار بعض لوگوں کے شوق مطالعہ کو بے مصرف بناتے ہیں۔
- مطالعے اور علمی ماحول کی نشوونما میں سہولتوں کی کمی بھی بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر کتابیں، رسالے اور اخبارات کافی تعداد میں نہ ہوں یا وقت پر مطلوبہ چیزیں نہ مل سکیں یا انھیں حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑے تو طلبہ بددل ہوجاتے ہیں اور مطالعہ کی جانب سے ان کا دل اچاٹ ہوجاتا ہے۔
- دنیا میں مصروف ترین لوگ بھی مطالعے کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ مسئلہ مصروفیت کا نہیں بلکہ تنظیم وقت کا ہے۔ اگر طلبہ منصوبہ بندی کے ساتھ وقت کا بہتر استعمال کریں تو قلتِ وقت کا شکوہ نہیں رہے گا۔

علاوہ ازیں مطالعہ کے لیے ماحول سازی بھی نہایت ضروری ہے۔ اس ضمن میں کتابوں کے انتخاب اور خرید کا کوئی منظم طریقہ کار اپنایا جائے۔ اسکول میں ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو اسکول کے سربراہ، لائبریرین، چیدہ چیدہ اساتذہ اور طلبہ کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ ایسے بورڈ کی تشکیل سے اساتذہ اور طلبہ میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ لائبریری ان کے لیے ہے اور ان کے مشوروں کے مطابق ترتیب دی جارہی ہے۔ طلبہ و طالبات کو لائبریری کے معاملات سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوگی اور ان کے ذاتی ذوق وشوق کی تسکین ہوگی۔ کتابیں خریدنے کے لیے اسکول کے سالانہ بجٹ میں زیادہ سے زیادہ رقم مختص کی جائے تاکہ مطلوبہ کتابیں خریدنے میں آسانی ہو۔ لائبریری میں نصابی کتابوں کے علاوہ حوالہ جاتی کتابیں مختلف زبانوں کی لغات، انسائیکلوپیڈیا، نقشہ جات، عام دلچسپی کی کتابیں، ماہنامے اور اخبارات کے علاوہ مختلف اہم شخصیات کے نجی کوائف اور نئی ایجادات سے متعلق معلومات موجود ہوں، کتابیں علیحدہ علیحدہ شعبوں کے مطابق ترتیب سے رکھی ہوں تاکہ طلبہ اپنے ذوق کے مطابق آسانی سے کتابیں تلاش کرسکیں۔ لائبریری میں مختلف عمر اور مختلف ذوق رکھنے والے طلبہ کی تسکین کا مواد موجود ہو، کم عمر کے طلبہ کی دلچسپی کا بھی خیال رکھا جائے۔ ان کے لیے بھی مختلف موضوعات پر آسان زبان میں لکھی ہوئی با تصویر کتابیں موجود ہوں۔ مزید برآں لائبریری میں سمعی اور بصری وسائلِ تعلیم موجود ہوں تاکہ طلبہ جدید سہولتوں سے استفادہ کرسکیں۔ لائبریری کے لیے بھی ایک پیریڈ ہو جس میں طلبہ لائبریری میں جاکر غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ کرسکیں۔ اساتذہ بچوں میں کتب بینی کا شوق پیدا کریں، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنا بیشتر فاضل وقت لائبریری میں گزاریں اور ہمیشہ کھوج میں رہیں کہ ان کے مضامین میں کیا نئی تحقیقات ہوئی ہیں، کون سی نئی کتاب شائع ہوئی ہے اور کون سا سمعی و بصری مواد بازار میں آیا ہے، جن کی مدد سے وہ اپنی تدریس کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اساتذہ طلبہ کو ایسے تفویضات دیں جن کی تکمیل کے لیے طلبہ کو لازماً لائبریری سے استفادہ کرنا پڑے اور یہ کوشش کریں کہ اپنے تفویضات میں زیادہ سے زیادہ حوالے مہیا کریں تاکہ کلاس میں انھیں بہتر گریڈ/نمبرات/پوزیشن/درجات مل سکیں۔ اس سے قطع نظر بعض سرگرمیاں ایسی ہیں جو طلبہ میں مطالعہ کا ذوق وشوق پیدا کرنے اور لائبریری کو ان کی تعلیمی زندگی کا لازمی حصہ بنانے میں بے حد مفید اور موثر ثابت ہوتی ہیں۔ اس طرح کی سرگرمیوں میں:

- ''میری پسندیدہ کتاب'' کے عنوان پر مشہور شخصیات کے پروگرام کا سلسلہ چلانا۔
- مصنفین کے ساتھ ان کی کتاب پر تبادلۂ خیال کا پروگرام رکھنا۔
- اسکول یا کلاس میں بلند خوانی کا سیشن منعقد کرنا۔
- مختلف موضوعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے الگ الگ گروپ یا فورم

تشکیل دینا۔

- ریڈنگ ڈے کا اہتمام کرنا۔ اس روز طلبہ غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ کریں۔
- تیز خوانی کے مقابلوں میں دی ہوئی کتاب تیزی سے پڑھ کر خلاصہ لکھنا اور انعام حاصل کرنا۔
- لائبریری سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے والے طالب علم کو Reader of the Month یا Reader of the year کا انعام دینا۔
- ماہانہ یا سہ ماہی ریڈنگ کیمپ کا انعقاد کرنا۔
- کتابوں کے تبصروں پر مشتمل ماہنامہ یا سہ ماہی قلمی رسالہ جاری رکھنا جس میں طلبہ کی پڑھی ہوئی کتابوں کے خلاصوں کو جگہ دی جائے۔
- ریڈنگ پارٹنر کی تشکیل جس کے تحت طلبہ اپنی خریدی ہوئی کتابیں یا رسالے اپنے طالب علم ساتھیوں کے ساتھ شیئر کریں۔
- طلبہ سے سالِ رواں میں چھپی ہوئی کتابوں سے بہترین اقتباسات منتخب کروانا، انھیں روم میں آویزاں کرنا اور ان پر انعامات دینا۔
- معیاری لائبریریوں کی سیر کرانا۔
- شہر کی معروف لائبریریوں کے کارڈ انعام میں یا باہم تحفتاً تبادلوں کی صورت میں یا دیگر طریقوں سے عام کرنا۔
- رسالوں کی خریداری کے تحفوں کی ہمت افزائی کرنا اور ان کا رواج عام کرنا۔ وغیرہ

اکثر طلبہ لائبریری کی سہولت سے فائدہ اٹھانے کے طریقے سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لیے جو بھی کتاب ان کے ہاتھ لگ جاتی ہے یا لائبریرین تھما دیتا ہے اسی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ زیادہ تر طلبہ یوں ہی کتاب یا رسالے کی ورق گردانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر طلبہ کو لائبریری سے پورا پورا استفادہ کرانا مقصود ہو تو انھیں مطالعے کا طریقہ اور پڑھنے کی تکنیک سکھانا بہت ضروری ہے۔ تربیتی کیمپ یا کسی اور طریقے سے طلبہ کو مطالعہ کے طریقوں کی معلومات دی جاسکتی ہے اور انھیں پڑھنے کی تکنیک سکھائی جاسکتی ہے۔ اس سے طلبہ اپنے مطالعہ سے کم وقت میں زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اس ذیل میں تربیتی کیمپ کے ذریعے طلبہ کو مندرجہ ذیل معلومات بہم پہنچانا نہایت ضروری ہے:

- غیر ضروری مواد پڑھنے سے اجتناب اور ترجیحات کا تعین کرنا سکھانا۔
- مطالعہ کے لیے علوم کے مختلف شعبوں کی اقسام سے متعلق واقفیت کرانا مثلاً مطالعۂ قرآن، مطالعۂ اسلامیات، مطالعہ درسیات، مقابلہ جاتی امتحان کے لیے مطالعہ، مطالعہ برائے شخصی ارتقا، ادب کا مطالعہ، نفسِ مضمون کا مطالعہ اور تفریحی مطالعہ وغیرہ۔
- مطالعے کی رفتار بڑھانے اور مطالعہ میں استحضار اور ارتکاز کے عملی طریقوں سے روشناس کرانے کے علاوہ تربیت دیتے وقت طلبہ کی ذہنی استعداد کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ان کے لیے بنیادی اصولوں سے معمولی واقفیت بھی کافی ہے۔ اس تربیت کا مقصد صرف یہ ہو کہ طلبہ اپنے مطالعے کی صحیح سمت متعین کر سکیں اور کتابوں سے کم وقت میں زیادہ استفادہ کر سکیں۔ طلبہ کے لیے مطالعے کے ان مراحل سے واقفیت از بس ضروری ہے۔
- صحیح کتاب کا انتخاب کرنا۔ اپنے مطالعہ کے مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے کتاب پڑھنا۔ کتاب کا خلاصہ یا تبصرہ لکھنا یا اپنا تاثر نوٹ کرنا۔ کتاب کے اہم مباحث کا تحریر و تقریر اور گفتگو میں استعمال کرنا۔ وغیرہ

اگر اسکول کے ذمہ داران اپنے طلبہ اور اساتذہ کو ایک اچھی اور معیاری لائبریری سے استفادے کا پورا موقع دینا چاہتے ہیں تو انھیں درج ذیل نکات پر سنجیدگی سے عمل کرنا نہایت ضروری ہوگا۔

- اسکول میں معیاری لائبریری قائم کرنا۔
- طلبہ کو لائبریری سے استفادے کی ہر ممکن سہولت فراہم کرنا۔
- طلبہ میں مطالعے کا ذوق پیدا کرنا۔
- طلبہ کو ریڈنگ تکنیک کی تربیت دینا۔
- علم کی جستجو میں مصروف طلبہ کی حوصلہ افزائی کرنا۔

ماضی میں اسکولوں میں مکمل طور پر درسی کتابوں پر انحصار کیا جاتا تھا اور اسباق کورٹ لینے کا طریقہ عام تھا لیکن اب تعلیم کا مقصد موثر اور مسلسل ترقی پذیر طریقۂ تعلیم کا ذریعہ طلبہ کی ذہنی اور علمی نشوونما ہے۔

نظریۂ تعلیم تبدیل ہونے کے باعث طریقۂ تدریس میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اب استاد کا کردار ایک رہنما اور تعلیمی معاون کا ہو گیا ہے۔ استاد سے اب یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مختلف اور متنوع طریقوں اور وسائل تعلیم کی مدد سے تدریس کے ایسے اثر آفریں اور پر زور طریقے اپنائیں جو سیکھنے کے عمل کو تیز تر کر دیں اور طلبہ کو خود آموزی پر آمادہ کریں۔ لائبریری ہی وہ اہم ترین تعلیمی اور سماجی وسیلہ ہے جو سماج کے ہر فرد کو خود آموزی میں مدد دیتا ہے۔ یہ ہمارا فرضِ اولیں ہے کہ لائبریریوں تک اپنے طلبہ کی رہنمائی کریں، ہماری یہ لائبریریاں علم کے سرچشمے ہیں۔ ان سے فیض یابی اشد ضروری ہے۔

حوالہ جات:

1۔ ماہنامہ رفیقِ منزل (مطالعہ نمبر) دسمبر 2002
2۔ لائبریری کو بہتر بنانے اور طلبہ کو مطالعہ کی طرف راغب کرنے کی تحریک از مسز مشیرہ خانم۔ مشمولہ ماہنامہ تعلیمی زاویے، لاہور اکتوبر 2003
3۔ Education Technology, Usha Rao

□□□

پتہ:
574, Belbagh, Gruwar Ward,
P. Malegaon - 423203
Distt. Nashik (M.S.)

اظہار اثر

ادب اطفال — نئی ضرورتیں، نئے تقاضے

یہ شکایت اکثر سننے میں آتی ہے کہ ادب اطفال کی جانب قلم کاروں کی توجہ کم ہے۔ اس کی کوئی ایک وجہ نہیں بلکہ بہت سے اسباب ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ بچوں کے رسالے یا کتابیں شائع کرنے والے ناشرین ادب اطفال تخلیق کرنے والے ادیبوں اور شاعروں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرے بچوں کے لیے لکھنے والوں کو ادبی دنیا میں وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جو دوسرے ادیبوں کو دیا جاتا ہے۔ تخلیق کار کو جو شہرت بڑوں کے لیے ادب تخلیق کرنے پر ملتی ہے۔ بچوں کے لیے لکھنے پر نہیں ملتی۔ لیکن میرے نزدیک سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے لیے تخلیقی قوت کے ساتھ تعلیمی نکات سے واقفیت اور بچوں کی نفسیات سے آگاہی بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے جتنے بھی ادیب ہوئے ہیں ان میں سے زیادہ تر تعلیمی اداروں سے وابستہ تھے جو اس حقیقت سے واقف تھے کہ صرف شہرت یا مالی منفعت کے لیے بچوں کے لیے لکھنا آنے والی نسلوں کے ساتھ بے انصافی کے مترادف ہے۔

ادب اطفال تخلیق کرنا بڑوں کے ادب سے زیادہ مشکل اور اہم کام ہے کیونکہ عام ادب کا قاری ایک بالغ دماغ رکھتا ہے اور بچوں کا ادب پڑھنے والے ناپختہ ذہن کے مالک ہوتے ہیں بچوں کے ادیب کے لیے بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے اور یہ فیصلہ بھی کرنا پڑتا ہے کہ وہ کس عمر کے بچوں کے لیے لکھ رہا ہے۔

اردو میں اسمٰعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، شفیع الدین نیر جیسے چند نام ملیں گے، جنھوں نے بچوں کے لیے ادب تخلیق بھی کیا اور دوسرے ادیبوں کو راہ بھی دکھائی کہ بچوں کا ادب کس طرح کا ہونا چاہیے۔

اگر ہم ماضی کے ادب اطفال کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ دو چیزوں پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ پہلی یہ کہ شعری ادب میں نغمگی کا عنصر زیادہ ہوتا کہ بچے اس سے لطف اٹھا سکیں اور یاد رکھ سکیں، دوسرے نثر میں ہیروازم کی ایسی کہانیاں لکھی جائیں جن کو پڑھ کر بچوں میں ہمدردی، سچائی اور بہادری کے جذبے پرورش پا سکیں۔ زیادہ توجہ شعری اور افسانوی ادب پر دی جاتی تھی کیونکہ اس وقت سمجھا جاتا تھا کہ خشک مضامین بچوں میں پڑھنے اور سیکھنے کا شوق نہیں ابھار سکیں گے لیکن زمانہ جس تیزی سے بدل رہا ہے اُسی تیزی سے بچوں کے ذہنوں کا ارتقا ہو رہا ہے۔ گذشتہ صدی کی دوسری دہائی تک عام لوگ ریڈیو جیسی ایجادات سے روشناس نہیں تھے البتہ گراموفون کچھ بڑے گھروں میں نظر آجاتا تھا اور اس کے سننے والے بچے تو کیا بڑے لوگ بھی حیران ہوتے تھے کہ اس چھوٹے سے ڈبے سے آواز کس طرح نکل رہی ہے۔ اس کے بعد جب ریڈیو آگیا تو لوگوں کی حیرت اور بڑھ گئی کیونکہ ریڈیو کے ذریعے دوسرے شہروں اور ملکوں کی خبریں اور آوازیں سنی جاسکتی تھیں۔ انھیں حیرت ہوتی تھی کہ ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھے گانے والوں کی آوازیں ان تک کیسے آرہی ہیں لیکن آج کے بچے کا ذہن ارتقا کی اس منزل میں داخل ہو چکا ہے کہ ریڈیو تو کیا ٹیلی فون، ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر جیسی ایجادات بھی اس کے لیے حیرت کی چیزیں نہیں رہیں۔

ابھی دو تین سال پہلے ایک خبر چھپی تھی کہ امریکہ میں ایک سولہ سترہ سال کے لڑکے نے اپنے گھر کے پیچھے بنے اسٹور روم میں تنہا بیٹھ کر ایٹم بم بنالیا تھا۔ کسی طرح یہ خبر حکومت کو مل گئی اور پولیس نے اس ایٹم بم کو اپنے قبضے میں لے کر پورے شہر کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ اس واقعے پر امریکہ میں ایک فلم بھی بن چکی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وقت کے ساتھ بچوں کا ذہنی ارتقا بھی ہوتا رہتا ہے اس لیے اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں جدید علوم سے زیادہ سے زیادہ روشناس کرایا جائے۔ اسکولوں میں بچے تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور نثر و نظم کی صورت میں ادب پڑھتے ہیں۔ سائنس کے طالب علم سائنس بھی پڑھتے ہیں لیکن ابھی تک ایسی کوشش نہیں کی گئی کہ عام بچے سائنس کی بنیادی معلومات حاصل کرسکیں۔ عام معلومات کے احاطے میں زندگی اور کائنات کی ہر شے آتی ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو علم یا معلومات کا تعلق کسی نہ کسی سائنس سے ہوتا ہے۔ ایک بچہ اپنے گھر میں پریشر کوکر پر روز کھانا پکتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پریشر کوکر کس طرح کھانا پکاتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ جس بھاپ سے کھانا پک رہا ہے اسی بھاپ سے ریل کے انجن اور بحری جہاز تک چلائے جاتے ہیں۔ وہ ایک بٹن دبا کر پنکھا چلا لیتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ بجلی کیا چیز ہے اور کس طرح پنکھے کو چلاتی ہے۔ بظاہر یہ باتیں آج معمولی نظر آتی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایجاد پر سائنسداں صدیوں کام کرتے رہے ہیں تب کہیں جاکر ہم آج کی آرام دہ زندگی گزارنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اب سے ہزاروں سال پہلے لوگ ایک آبادی سے دوسری بستی تک کے فاصلوں کو ہفتوں اور مہینوں میں طے کرپاتے تھے لیکن آج آپ دنیا کے کسی ایک شہر سے دوسرے شہر تک گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ گھر بیٹھے دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھے اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے باتیں کرسکتے ہیں بلکہ اب تو کمپیوٹر کے ذریعے آمنے سامنے آکر بھی باتیں کی جاسکتی ہیں یعنی اب ہزاروں میلوں کے فاصلے نے سمٹ کر پوری دنیا کو ایک چھوٹے سے گلوب کی شکل دے دی ہے اور یہ سب کچھ سائنسی علوم کی وجہ سے ہوا ہے اس لیے بچوں کو مستقبل کی زندگی کے لیے تیار کرنے کے لیے ہر طرح کی سائنسی معلومات سے روشناس کرانا بہت ضروری ہوگیا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ سائنسی معلومات اور تعلیمات پر زیادہ توجہ دی جائے۔ اور جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے اس معاملے میں اردو زبان سب سے زیادہ پسماندہ زبان ہے۔

آج کے زمانے میں پرانے محاورے کے خلاف ''ماسٹر آف ون'' کی بجائے'' جیک آف آل'' ہونا بہت ضروری ہے۔ بنیادی طور پر سائنسی علوم تین شعبوں میں منقسم ہیں۔ نمبر (1) فزکس یعنی طبعیات، (2) بایولوجی یعنی علم الحیات،

اور (3) کیمسٹری یعنی کیمیاوی سائنس لیکن اب ان سائنسوں سے بے شمار شاخیں پھوٹ کر نئے نئے سائنسی علوم وجود میں آچکے ہیں مثلاً علم الفلکیات فزکس کی ہی ایک شاخ مانا جاتا ہے الیکٹرانکس کا تعلق فزکس سے ہی ہے۔ آج کی Genetic جینٹک سائنس علم الحیات یا بایولوجی سے تعلق رکھتی ہے۔ کیمسٹری کے ذریعے نئی نئی ایجادات کی جارہی ہیں اور حیات کو سمجھنے کی کوششیں جاری ہیں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سائنسی معلومات کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے اس سے سائنسی ایجادات اور معلومات کو عام فہم زبان کے ذریعے نئی نسل تک پہنچانا بہت ضروری ہوگیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ نئی نسل تک یہ معلومات کس طرح پہنچائی جائیں۔ دنیا کے دوسرے ممالک اور زبانوں میں بچوں تک یہ معلومات پہنچانے کے لیے ان کو تین گروپوں میں تقسیم کرکے ان کے لیے کتابیں لکھی جاتی ہیں اس تقسیم میں بچوں کے پہلے گروپ میں تین چار سال کی عمر سے لے کر سات آٹھ سال کی عمر تک بچے آتے ہیں۔ بچوں کا یہ گروپ بچپن کا گروپ کہا جاتا ہے۔ دوسرا گروپ لڑکپن کے زمرے میں آتا ہے اس گروپ میں سات آٹھ سال کی عمر سے لے کر بارہ تیرہ سال کی عمر تک کے بچے آتے ہیں اور اس کے بعد سولہ سترہ سال کی عمر کے بچوں کو ٹین ایجز Teen Ager یا بلوغت کی حدوں میں داخل ہونے والے بچے کہا جاتا ہے۔

اس تقسیم کے مطابق بچوں کے لیے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں اُن میں زبان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے مثلاً بچپن کے گروپ کے لیے ایسی کتابیں لکھی جاتی ہیں جن میں لغت کے زیادہ سے زیادہ دو سے تین ہزار الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ لڑکپن کے گروپ کے لیے پانچ ہزار سے دس ہزار تک الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ اس طرح بچوں کو یہ کتابیں پڑھنے اور ان کے مضامین کو سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔

بچوں کے اذہان ایک محدود حد تک چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں لیکن ان کا تجسس نئی چیزوں کو سمجھنے میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس گروپ کے لیے اگر معلومات عامہ اور سائنس کی کتابیں لکھی جائیں تو ان میں پہلے ان چیزوں کے بارے میں سمجھانا ضروری ہے جن سے ان بچوں کا واسطہ رات دن پڑتا رہتا ہے۔ مثلاً پریشر کوکر کے حوالے سے ان کو بھاپ کی قوت اور اس کے کارناموں سے روشناس کرایا جاسکتا ہے۔ بجلی کے بلب یا پنکھے کے حوالے سے سمجھایا جاسکتا ہے کہ بجلی کس چیز سے کس کس طرح بنائی جاسکتی ہے۔ دھات کے تاروں میں بجلی کیسے دوڑتی ہے اور ہمارے گھروں میں آکر ریڈیو ٹیلی ویژن فریج وغیرہ کیسے چلاتی ہے اسی طرح لڑکپن کے گروپ والے بچوں کو آسان لفظوں میں سمجھایا جاسکتا ہے کہ رسل و رسائل کے آلات میں الیکٹرانک قوت کس کس طرح کام کرتی ہے۔ یہ بھی سمجھایا جاسکتا ہے کہ آسمانی بجلی اور ہمارے گھروں میں آنے والی بجلی بنیادی طور پر ایک ہی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ہمارے اردگرد حالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں موسم بدلتے رہتے ہیں قدرتی حادثات آندھیوں طوفانوں اور زلزلوں کی صورت میں آتے رہتے ہیں۔ بارشیں کیوں ہوتی ہیں بادل کیسے بنتے ہیں اور کس طرح برستے ہیں ان تمام سوالوں کو آسان زبان میں سمجھایا جاسکتا ہے۔ تیسرے گروپ کے طالب علم جو بلوغت میں قدم رکھ رہے ہیں ان کے ذہن زیادہ کشادہ ہوجاتے ہیں۔ معلومات میں اضافہ ہوجاتا ہے اس لیے وہ بہت سے پیچیدہ مسئلوں کو سمجھنے لگتے ہیں ان کو ہر سائنس کے بارے میں سمجھانا قدرے آسان ہوجاتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ زبان میں سائنسی اصطلاحیں کم سے کم استعمال کی جائیں۔ اگر کہیں کوئی سائنسی اصطلاح استعمال بھی کرنی پڑے تو اس کی وضاحت کردی جائے تاکہ طالب علم کا ذہن اس کو قبول کرسکے۔

اسلوب بیان اور زبان ایسی کتابوں کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سائنس کے کسی موضوع پر لکھنے کے لیے سائنس کا وہ نظریہ یا مسئلہ خود ادیب کے ذہن میں پوری طرح واضح اور صاف ہو تبھی وہ اس مسئلے کو آسان لفظوں میں سمجھا سکے گا۔ اگر کسی سائنسی نظریہ کے بارے میں ادیب کا ذہن صاف نہیں ہے تو وہ اسے کیسے واضح کرسکتا ہے اب آخر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کے لیے اس طرح کے مضامین اور کتابیں کون لکھ سکتا ہے یا کس طرح لکھوائی جاسکتی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس طرح کی کتابیں زیادہ تر معقول معاوضہ دے کر ماہرین سے لکھوائی جاتی ہیں تاکہ وہ معاشی الجھنوں سے بے فکر ہوکر پوری توجہ سے یہ کام کرسکیں یا بہت سے اصحاب جو معاشی فکروں سے آزاد ہوتے ہیں۔ قومی اور نسلی ہمدردی کی خاطر بغیر کسی معاوضے کے بھی اس طرح کی کتابیں لکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ہر زبان کے ادیب معاشی مشکلات کا شکار رہتے ہیں اور اردو زبان تو خاص طور پر تمام زبانوں سے زیادہ غریب زبان بن چکی ہے۔

ہندوستان میں بچوں کے جتنے بھی رسالے شائع ہوتے ہیں ان میں شاید اردو اکادمی کا رسالہ ''امنگ'' ایسا ہے جو لکھنے والوں کو معاوضہ دیتا ہے اگرچہ آج کے حالات کے مطابق وہ معاوضہ معقول نہیں کہا جاسکتا ریڈیو اور دوسرے سرکاری رسالے بھی اس قدر کم معاوضہ دیتے ہیں کہ لینے والوں کو شرم آنے لگتی ہے۔ پرائیویٹ ادارے تو یہ توقع رکھتے ہیں کہ ادیب بغیر کسی معاوضے کے ان کے لیے لکھتے رہیں۔

یہ بھی سچ ہے کہ اردو کے ادارے خود بھی مالی مشکلات میں گرفتار رہتے ہیں کیونکہ رسالے اور کتابیں بہت کم تعداد میں فروخت ہوتی ہیں جس کی وجہ سے مالی منفعت بہت کم ہوتی ہے لیکن یہ سوچنا بھی تو ضروری ہے کہ بچوں کا ادب لکھنے والے ادیب بھی اسی معاشرے میں سانس لیتے ہیں اور وہ بھی مالی مشکلات کا شکار رہتے ہیں۔ ان مسائل کو نظر میں رکھتے ہوئے اردو اکادمیاں اور ایسے اردو ادارے جو منافع بخش کاروبار کررہے ہیں، کیا یہ نہیں کرسکتے کہ ماہر حضرات کو اسکالرشپ کے بطور کچھ ماہانہ معاوضہ دے کر ان سے کتابیں اور مضامین لکھوائیں اور اس طرح کتابیں لکھوانے کا فیصلہ کیا جائے تو پہلے ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی بنا کر یہ فیصلہ کیا جائے کہ وہ کس عمر کے بچوں کے لیے کتابیں لکھوانا چاہتے ہیں اور کتاب میں کس طرح کے مضامین یا موضوع ہونے چاہئیں۔ جب ادیب ان کے مشوروں کے مطابق کتاب مکمل کردے تو ماہرین تعلیم حضرات کی ایک دوسری کمیٹی اس کتاب کا جائزہ لے اور اگر اس میں کوئی کمی محسوس ہو تو ادیب سے اس کمی کو دور کرائے۔ اس طرح جو بچوں کا ادب تخلیق ہوگا وہ بہتر طور پر نئی نسل کی رہنمائی کرسکے گا۔

□□□

پتہ:
Y-5, New Ranjit Nagar, New Delhi-110008

مرضیہ عارف

اردو مشاعروں کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت

(بھوپال کے تناظر میں)

مشاعروں کو ایک تہذیبی روایت کی شکل دینے اور ان میں شائستگی و ادب کو ملحوظ رکھنے کی روایت میں اردو کے صوفی شعرا کا بھی اہم حصہ رہا ہے، خواجہ میر درد کے گھر پر ہر ماہ ایک شعری نشست ہوتی تھی، جس میں بادشاہ وقت بھی شرکت کرتے تھے ایک مرتبہ مغل شہنشاہ عالم ثانی کی طبیعت ناساز تھی لیکن وہ مشاعرے میں پہنچے اور تکلیف کی وجہ سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے، ان کا یہ عمل آداب مشاعرہ کے خلاف تھا لہٰذا میر درد نے اعتراض کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ حضرت! اگر طبیعت ناساز تھی تو شعری نشست میں شریک ہونے کی زحمت کیوں کی؟ احمد شاہ ابدالی کی دلی پر حملہ اور قتل و غارتگری سے یہاں کی آبادی دوسرے شہروں کو منتقل ہوگئی، لکھنؤ بھی اردو شعرا کا مرکز تھا اس لیے دہلی کے بیشتر شعرا اپنی تمام تر شعری روایات کے ساتھ وہاں چلے گئے، ان دنوں لکھنؤ میں امن و خوشحالی کا دور دورہ تھا، نوابان اودھ شعر و ادب کے بڑے پرستار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی سرپرستی بھی کررہے تھے لہٰذا وہاں مشاعروں کی محفلیں سجنے لگیں اس کا نقطہ آغاز وہ مشاعرہ بتایا جاتا ہے جس میں میر تقی میر نے اتفاقاً شرکت کی، وہ لکھنؤ پہنچ کر جس سرائے میں ٹھہرے اس کے قریب ہی مشاعرے کا انتظام ہو رہا تھا، میر تقی میر کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے بھی شرکت کا ارادہ کیا، حالانکہ ان کا حال خراب تھا، طویل سفر طے کرنے کی وجہ سے لباس گرد آلود اور شکستہ ہوگیا تھا، چہرہ الم و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا، اس ہیئت کے ساتھ میر صاحب جب مشاعرہ گاہ میں داخل ہوئے تو لکھنؤ کے نازک مزاجوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ مشاعرہ پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھیں ایک معمولی شاعر تصور کر کے سب سے پہلے شمع ان کے آگے رکھ دی اور آوازیں کسے جانے لگے، میر کی نازک مزاجی اور حساس فطرت نے اس کا کافی اثر قبول کیا اور فی البدیہہ اشعار کہہ کر اپنا تعارف کرایا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو، پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے، ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا، عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی، جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے، ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں، اسی اجڑے دیار کے

اہل لکھنؤ کو جب معلوم ہوا کہ ان کے سامنے ریختہ گویان ہند کے استاد اعظم میر تقی میر ہیں تو اپنے نازیبا رویے پر شرمندہ ہوئے اور میر صاحب سے معذرت کی، اس زمانے میں لکھنؤ شعر و سخن اور علم و فن کی فضا میں ڈوبا ہوا تھا، اودھ کے نواب شیعہ تھے اس لیے وہاں محرم دھوم دھام سے منایا جاتا تھا، اس کی مجالس میں مرثیہ خوانی ہوتی، شاعر اور سامعین کے دل میں واقعۂ کربلا کی جذباتی اور مذہبی کشش تھی، اردو ادب کو ان مجالس کی دین مرثیہ اور اس کا فن ہے۔

1857 کے بعد جب اس نظام کا زوال ہوا تو مشاعروں کی پرانی روایت بھی تبدیل ہوگئی، مولانا حالی اور محمد حسین آزاد نے لاہور کا رخ کیا اور شعری روایات نیز زبان کی تطہیر کے ساتھ مشاعرے کی فضا کو بدلنے کے لیے ''انجمن پنجاب'' کی تشکیل کر کے شاعری کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا، اب مشاعرے طرحی نہیں موضوعاتی ہونے لگے یعنی مشق سخن کے لیے مصرع طرح کے بجائے موضوع کا انتخاب ہونے لگا، رگ گل سے بلبل کے پر باندھنے کی روایت دم توڑ گئی اور حقیقت نگاری کو فروغ ملا، بیسویں صدی کے ربع اول میں جب مجاہدین آزادی کو قید و بند کا شکار بنایا گیا تو جیلوں میں عالم، شاعر اور دانشوروں کی بڑی تعداد جمع ہوگئی اور انھوں نے وہاں اپنی محفلیں بھی منعقد کیں، ان کی جو رپورٹیں روزنامہ ''زمیندار'' لاہور میں شائع ہوئیں، ''مشاعرہ زنداں'' کے نام سے اتر پردیش اردو اکادمی نے انھیں کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اردو شعر و ادب کا دامن جیسے جیسے سماجی اور سیاسی تحریکات سے جڑنے لگا، شعرا بھی ایسے جلسوں میں شرکت کرنے لگے، علامہ اقبال کی مشہور نظم ''شکوہ اور جواب شکوہ'' انھی مشاعروں کی دین ہے، آزادی کے بعد بجلی اور لاؤڈ اسپیکر کا زمانہ آیا تو مشاعروں کی شکل و صورت میں انقلابی تبدیلی رونما ہوگئی، پہلے مشاعروں میں شاعر کے سامنے شمع رکھ کر اس کا کلام سنا جاتا تھا، اب ان کی فہرست مرتب ہونے لگی ہے، جس شاعر کا نام مشاعرے کا ناظم پکارتا ہے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مائک پر آتا اور کلام سناتا ہے، کم و بیش اسی زمانے سے مشاعروں میں ترنم نے رواج پایا، جس کو جگر مرادآبادی نے مقبولیت عطا کی، اس دور میں زبان کی تراش اور خراش کے بجائے خیال کی سادگی اور فکر کی ندرت پر زیادہ زور دیا گیا، جس کی وجہ سے مشاعروں کی کشش اور وسعت دونوں میں اضافہ ہوا، اخبارات کے فروغ نے بھی مشاعروں کی مقبولیت میں حصہ لیا، ترقی پسند تحریک کے اثرات ان مشاعروں میں نظر آنے لگے، شعرا کی تخلیقات میں نئے شعور، نئی فکر اور سماجی رشتوں کی آبیاری اس عہد کی دین ہے، شاعروں نے مشاعروں کے وسیلہ سے نہ صرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامعین کے سامنے پیش کیا اردو کی شاعری کو نئی جہت اور نئی معنی آفرینی سے بھی آشنا کر دیا۔

اردو مشاعروں کی دو سو سالہ تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا

ہے کہ وقت کے ساتھ مشاعروں کا کردار، انداز اور اثرات بھی بدلتے رہے ہیں، میر وسودا کے عہد کے جو مشاعرے، محلوں اور حویلیوں میں مراختے کے نام سے ہوتے تھے اور خواص ان میں حصہ لیتے تھے، بعد میں آتش وناسخ کے دور میں وہ عام سامعین کی دسترس میں آگئے اور یوں اردو شاعری کو مقبول بنانے میں انھوں نے اہم حصہ لیا اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے، ان مشاعروں کے وسیلے سے سامعین کی داد وتحسین حاصل کرنے کے لیے شاعر ہر زمانے میں عام فہم زبان کا استعمال کرتے رہے اور انھوں نے ایسے مضامین کو بھی اپنے اشعار میں سمونے کی کوشش کی جس سے سننے والے لطف اندوز ہوسکیں، ان مشاعروں نے بیسویں صدی میں عوام کے سیاسی وسماجی شعور کو بیدار کرنے اور نکھارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

بھوپال میں کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے نواب سکندر جہاں بیگم نے 1859 میں اردو کو باقاعدہ سرکاری زبان کا درجہ دیا لیکن ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی تحقیق کے مطابق اردو شاعری کے نمونے یہاں اٹھارھویں صدی کے ابتدائی حصہ میں مل جاتے ہیں جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ تقریباً نصف صدی کے ارتقا کا نتیجہ ہیں اور یہاں کی شاعری ولی اورنگ آبادی کی تحریک شعری کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ مقامی حالات وتقاضوں کا نتیجہ ہے۔

ریاست بھوپال کے دارالحکومت شہر بھوپال کے علاوہ اطراف میں بھی شعر وشاعری کا چرچا 18ویں صدی میں عام ہوگیا تھا اور اسی زمانے میں رافت تلمیذ جرأت، مسکین تلمیذ مومن، رفعت تلمیذ غالب، کرم تلمیذ مومن، شہپر تلمیذ غالب، سیکش تلمیذ غالب کی موجودگی سے یہاں شعری نشستوں اور مشاعروں کے سلسلے کا آغاز ہوگیا تھا، نواب صدیق حسن خاں کی بدولت اہل لکھنؤ کی آمد بڑھی تو یہاں کی شاعری میں لکھنؤ اسکول کا رنگ بڑھنے لگا، اس دور کے بھوپال میں امیر مینائی کے شاگردوں کی کثرت تھی البتہ داغ دہلوی کے شاگرد برائے نام تھے جن کی شعری محفلیں بھی خوب جمنے لگی تھیں۔ لیکن خاتون حکمرانوں کے اثرات اپنا کام کر رہے تھے اس لیے اس وقت کے کسی قابل ذکر مشاعرے کا حوالہ نہیں ملتا۔ 1897 اور 1900 میں امیر مینائی کی بھوپال آمد پر یہاں ان کا اعزاز واکرام ہی نہیں ہوا شعری مجلسیں بھی منعقد ہوئیں اور نومشق شعرا بکثرت ان کے شاگرد بن گئے۔ ذکی بدایونی کی کتاب میں آئینۂ مشاعرہ کے نام سے بھوپال کے ایک اور مشاعرے کا حوالہ ملتا ہے جو 1910 میں یہاں ہوا اور اس میں سراج میر خاں سحر نے بھی شرکت کی تھی، اسی طرح جگر مرادآبادی کئی مرتبہ بھوپال تشریف لائے تو یہاں کے شعری ماحول میں بہار آگئی، گلی گلی میں ان کی غزلوں اور ترنم کی گونج سنائی دینے لگی بقول پروفیسر عبدالقوی دسنوی عام طور پر یہ محفلیں رات آٹھ سے دو تین بجے رات تک جمی رہتی تھیں، بھوپال کے تقریباً تمام اچھے شعرا ان میں حصہ لیتے، حفیظ جالندھری کی بار بار آمد اور نیاز فتح پوری نیز جاں نثار اختر کی موجودگی نے بھی شعر وشاعری اور مشاعروں کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ تاہم سب سے پہلا بڑا مشاعرہ نواب حمید اللہ خاں والیِ ریاست بھوپال کی سالگرہ پر 1940 میں صدر منزل میں منعقد ہوا، اس میں اردو شعرا کی ساری کہکشاں اتر آئی تھی، فانی، سیماب، جوش، جگر، احسان دانش، ساغر، سہا مجددی، ہر بڑا شاعر موجود تھا، انجمن ترقی پسند مصنفین کی یہاں 1949 میں جو کانفرنس ہوئی، اس میں ایک مرتبہ پھر اردو شعر وادب کے آفتاب ومہتاب کا اجتماع ہوا اور حمیدیہ کالج میں ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا گیا، لیکن اس سے قبل سراج میر خاں سحر، ذکی، وارثی، منیر بھوپالی، مائل نقوی، سہا مجددی کے دم سے یہاں کی شعری مجلسوں کی رونق دیکھتے سے تعلق رکھتی تھیں۔

مرکزی حکومت میں ریاست بھوپال کے انضمام کے بعد اور بھی کئی بڑے مشاعرے اس شہر میں ہوئے، جن میں 1957 کے دوران انجمن ترقی اردو کی کانفرنس کے موقع پر صدر منزل کا مشاعرہ اور 1969 میں نیاز فتح پوری کی سرپرستی وصدارت میں غالب کے مصرع پر صدر منزل کے مقابل میدان میں طرحی مشاعرہ اہمیت کا حامل ہے، یہاں ''اقبال ڈے'' پر اقبال لائبریری نے جو مشاعرے کرائے، وہ بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، لیکن اس سلسلے کا سب سے بڑا اور تاریخی انڈو پاک مشاعرہ ایمرجنسی کے بعد 1977 میں لال پریڈ گراؤنڈ پر مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے کرایا۔ اس میں پاکستان سے دلاور فگار کے علاوہ ہندوستان کے تقریباً تمام اہم شعرا نے شرکت کی، اٹل بہاری واجپئی نے بحیثیت وزیر خارجہ اس کی صدارت کی اور معروف ناقد وصحافی ظ۔انصاری نے نظامت انجام دی، تقریباً پانچ سال بعد 1982 میں موجودہ اقبال میدان میں ہفت روزہ ''ایاز'' کی دس سالہ تقریبات کے موقع پر ایک اور انڈو پاک مشاعرہ ہوا، اس میں پاکستان سے قتیل شفائی، مجیب خیرآبادی، بھوپال نژاد و پروردہ غلام اللہ خاں افسوں اور ہندوستان سے بھی قابل ذکر شعرا شریک ہوئے، علاوہ ازیں آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے ریڈیائی مشاعرے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سالانہ تقریبات کے موقع پر ہونے والے مشاعرے بھی اپنی نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے اہم مشاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں، جن میں پاکستان سے احمد فراز بھی شریک ہوچکے ہیں۔ سیفیہ کالج بھوپال کو آج سے پندرہ بیس سال پہلے تک اردو زبان وادب کی نرسری کی حیثیت حاصل تھی، اس کالج کی سالانہ تقریبات کے تحت بڑے بارونق مشاعرے ہوا کرتے تھے اور ان کے اہتمام میں اسٹوڈنٹس لیڈر کی حیثیت سے نوجوان عارف عقیل پیش پیش رہتے تھے، مشاعروں سے عارف عقیل کی یہی دلچسپی اور تعلق کا مظہر ''انجمن کہکشان ادب'' کے مشاعرے بھی ہیں۔ اس انجمن نے ڈھائی سال کے مختصر عرصہ میں بشمول انڈو پاک مشاعرہ تین مشاعرے اور بارہ دیگر ثقافتی پروگرام منعقد کرا کے بھوپال کے مشاعروں کی تاریخ میں اپنا ایک مقام محفوظ کرا لیا ہے۔

□□□

پتہ:
Ghati Bharbhooja Raod,
Talayya,,BHOPAL -462001 (M.P.)

رفعت کاظمی

دردآشنا

ندا اپنے خیالوں کے میں ڈوبی ہوئی تھی

اچانک اس کے کانوں میں آواز آئی ـــ

''ندالو میں آگئی... پتہ ہے آج میں بہت خوش ہوں''

حیا ندا کی اچھی دوست تھی۔

ندا نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی، اس کی زبان سے نکلا! ''کیا ارمانوں کا جنازہ یونہی نکلتا ہے؟''۔

حیا سمجھ گئی پر آنسوؤں کو چھپا کر کہا ''اے ندا کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آج تمھاری مہندی کی رسم ہے یہ جنازے والی بات کہاں سے آگئی؟

حیا! تم کب آئیں؟ ندا نے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اچھا! جیجو کے خیالوں میں اس قدر گم ہوگئی ہو کہ میرے آنے کا پتہ ہی نہیں چلا''۔ حیا نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''ندا تجھے ایک بات کہوں۔''

''ہاں ہاں کہو!''

''ندا تم مجھے بے حد عزیز ہو میں نے تمھیں پل پل ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے اب جو تم نے کسی حد تک اپنے آپ کو سنبھالا ہے پلیز اب پھر سے خود کو بکھرنے مت دینا، وہ بھی اس انسان کی خاطر...'' حیا نے بات ادھوری چھوڑ دی، کیونکہ اس کی نگاہوں کے سامنے ندا کا سراپا، اس کی ڈبڈبائی آنکھیں اور اس کا بکھرا ہوا وجود تھا جس کو دیکھ کر حیا کا دل کرچی کرچی ہوگیا اور ندا کو یوں ہی چھوڑ کر باہر برآمدے میں آگئی، جہاں سب لوگ مختلف کاموں میں مشغول تھے۔

اچانک حیا پر ندا کی والدہ کی نظر پڑی اس کو یوں پریشان دیکھ کر مخاطب ہوئی ''ارے حیا بیٹی! سہیلی کے جانے کا غم ابھی سے ستانے لگا ہے۔ ابھی وہ دو دن تمھارے ہی ساتھ رہے گی۔ اللہ کرے تم دونوں کی یہ دوستی ہمیشہ قائم رہے۔

''ہاں اب اٹھو، چلو، ابھی بہت کام پڑے ہیں۔''

''ہاں آنٹی چلیے''

شام کو حیا ندا کے ہاتھوں میں مہندی لگا رہی تھی لیکن ندا اپنے آپ میں گم ماضی کے اوراق الٹ رہی تھی۔

''ندا میں نے تم سے کبھی پیار ہی نہیں کیا، تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے'' عامر کی باتیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ندا کالج کی طالبہ تھی، عامر بھی اسی کالج کا ذہین و فطین طالب علم تھا۔ ندا نیک اور نرم طبیعت لڑکی تھی۔ ایک دن عامر نے ندا اور حیا سے کہا کہ تم دونوں اس کالج میں نئی آئی ہو، اگر کبھی بھی کوئی Problem ہو جائے تو بے جھجک کہہ دینا۔ حیا نے شکریہ ادا کیا لیکن ندا کو عامر کا یہ طریقہ، یہ انداز اس قدر بھا گیا کہ آہستہ آہستہ عامر اس کی رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ عامر کا جھکاؤ بھی ندا کی طرف اسی قدر تھا لیکن دونوں خاموش تھے۔ حیا نے بھی یہ محسوس کیا کہ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے پیار ہے مگر فکر مند تھی دونوں کی خاموشی سے۔ ندا ہر پل صرف عامر کے بارے میں سوچتی تھی۔

لیکن عامر کے سر پر انتقام کا بھوت سوار تھا ـــ اور ندا اس سے بے خبر تھی۔

ایک دن ندا اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کی ماں نے اسے اصغر سے رشتے کے بارے میں بتایا، جو کچھ دنوں پہلے آیا تھا۔ تمھارے ابا کو یہ رشتہ بہت پسند ہے۔ کہہ رہے تھے لڑکا بڑا ہی نیک اور شریف ہے یہ سن کر ندا کو جیسے کسی نے کھائی میں دھکیل دیا، ندا کی امی نے اس کی خاموشی کو شاید اقرار سمجھا اور خوش ہو کر بیٹی کی بلائیں لی۔

ندا پوری رات روتی رہی۔

دوسرے دن کالج میں اس نے حیا سے سارا ماجرا بیان کیا۔ حیا نے مشورہ دیا کہ یوں گھٹ گھٹ کر مر جانے سے بہتر ہے کہ تم عامر سے بات کرو۔

''تمھیں ہمت سے کام لینا ہوگا کب تک اس آگ میں جلتی رہوگی،

عامر کو آتے دیکھ کر حیا اور ندا دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

حیا لائبریری کا بہانہ کر کے وہاں سے چل دی۔

ندا نے حیا کو روکنا چاہا مگر اس کی زبان پر جیسے تالا لگ گیا ہو۔

''کیا بات ہے ندا کچھ پریشان لگ رہی ہو۔'' عامر نے کہا۔

ندا گھبرائی ہوئی تھی۔ کہنے لگی ''ہاں عامر! گھر میں میرے رشتے کی بات چل رہی ہے۔''

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔'' عامر نے جواب دیا۔ مگر ندا اسے مذاق سمجھتی رہی۔

''لیکن عامر تم تو جانتے ہو کہ میں...... کیا میں

میں تمھارے سوا کسی دوسرے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔

تم ہوش میں تو ہو، شادی...وہ بھی تم سے... تمھیں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے،

تم جیسی لڑکیاں جانے کتنوں میں Involved ہوتی ہیں، میں نے تم سے کبھی پیار ہی نہیں کیا، تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں،'' عامر بلا تامل بولے جا رہا تھا۔

حیا جو لائبریری کی طرف سے آ رہی تھی عامر کی باتیں سن کر سکتے میں آ گئی۔ ندا کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو خون نہیں۔ پھٹی پھٹی نظروں سے وہ عامر کو دیکھے جا رہی تھی، عامر ابھی کچھ اور بولنے والا تھا کہ حیا بے قابو ہو گئی...

''بس عامر بس! اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ تم پر اٹھ جائے دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ تم جیسے کمینے، بے غیرت اور خود غرض انسان سے بات کرنا بھی مجھے گوارا نہیں۔ تم نے ندا کی بے لوث، بے غرض اور پاک محبت کو پامال کیا، یاد رکھنا اس کی سزا تمھیں ضرور ملے گی۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔

ندا کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔ حیا نے ندا کو سنبھال کر اپنے کندھوں کے سہارے آٹو میں بٹھایا اور سیدھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔

ڈاکٹر نے ندا کا چیک اپ کیا اور کچھ دوائیاں اور انجکشن دیے اور حیا سے کہا، ذہنی دباؤ کی وجہ سے ایسا ہوا ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں، ایک دو گھنٹے میں ہوش آ جائے گا۔

حیا حالتِ اضطراب میں تھی کہ ندا کا کیا ہوگا جو دل و جان سے اس فریبی پر فدا ہے، اس صدمے سے کیسے نکل پائے گی، یا اللہ تو ہی ندا کو صبر دینا۔

دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر کی اجازت سے حیا ندا کو گھر لے آئی۔

ندا کی امی بیٹی کی حالت دیکھ کر بہت گھبرا گئی۔

''حیا، کیا ہوا میری بچی کو۔''

''کچھ نہیں آنٹی گرمی کی وجہ سے اس کو چکر آ گیا تھا، ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں بھی دی ہیں فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔

اس دن کے بعد ندا بالکل خاموش رہنے لگی، دونوں سہیلیوں نے اس واقعے کو سینے میں دفن کر لیا۔

برات والے دن جب ندا سسرال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی سب سے رخصت ہونے کے بعد حیا کو گلے لگایا۔

حیا کے دل سے ندا کے لیے دعا نکلی۔۔۔ ''ندا تمھیں اصغر سے اتنا پیار ملے جو تمھارے ہر زخم کو مندمل کر دے، جن گہرے زخموں کی میں چشم دید گواہ ہوں۔''

ندا اپنے شوہر اور پیارے سے بچے کے ساتھ بہت خوش تھی پھر بھی نہ جانے کیسی چبھن تھی جو پھانس بن کر اس کو ہر وقت بے چین رکھتی تھی۔

''اصغر، امی کا فون آیا تھا ہم دونوں کو آج بلایا ہے۔ ہمیں ضروری جانا ہے۔''

اصغر پیشے سے ڈاکٹر تھا۔

''ندا تم ایسا کرو کہ ہسپتال آ جانا میں بھی ضروری کام نمٹالوں گا پھر ساتھ چلیں گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''

ندا جب ہسپتال پہنچی تو اصغر اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ وہاں موجود نرس سے اس نے پوچھا:

''نرس ڈاکٹر اصغر اس وقت کہاں ہوں گے؟''

''میڈم، مجھے انھوں نے ہی بھیجا ہے ان کا ایک ایمرجنسی کیس ہے۔ مریض کی حالت بہت نازک ہے آپ کو Wait کرنے کے لیے کہا ہے۔''

''اچھا۔''

ندا کا جی نہ جانے کیوں گھبرانے لگا اس نے بچے کو گود میں اٹھایا اور ایمرجنسی وارڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے قدم اس وقت جم سے گئے جب اس کی نظر بستر پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے عامر پر پڑی۔ ماضی کی کتاب کا ورق ورق الٹنے لگا۔

اصغر باہر آیا اور ندا کو حالت غیر میں دیکھ کر کہنے لگا...

''ندا کیا ہوا، تم ٹھیک تو ہو نا، ہاں اصغر! یہ کون ہے؟''

''یہ عامر ہے میرا دوست، میرا جگری دوست یہ تین برسوں سے کوما میں ہے۔ آج جب ہوش آیا تو کچھ ڈھونڈھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لگتا ہے شاید اسے کسی کی تلاش ہے۔''

''کس کی'' ندا بے ساختہ بول پڑی۔

''تمھاری''

''اصغر آپ.....''

''ہاں ندا میں سب کچھ جانتا ہوں...

اس نے اپنے کیے کی سزا پائی ہے، یہ تمھاری بے لوث محبت کو سمجھ نہیں سکا۔ (شاید کوئی مجبوری رہی ہو) تمھارا دل بہت بڑا ہے، Please اسے معاف کر دو۔''

ندا شش و پنج میں مبتلا تھی کہ کیا کرے۔ آخر آہستہ آہستہ عامر کے بستر کے قریب گئی جہاں عامر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ عامر نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ندا کی طرف دیکھا۔ عامر زار و قطار رو رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو ''ندا سچ میں تمھاری سزا کا مستحق ہوں۔'' ندا کی بھی آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔

عامر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر چکا تھا۔

□□□

پتہ:
C/o Syed Mohd. Shah
Sartibang, Raina Wari
Sri Nagar, Kashmir
190003 (J & K)

سید داؤد اشرف

مولوی علاء الدین

حیدرآباد کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انگریزوں کے دباؤ اور ان سے گہرے تعلقات کی وجہ سے یہاں انگریزوں کے خلاف آزادی کے میلانات کا زور پکڑنا ممکن نہ تھا۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے لیکن پہلی جنگ آزادی 1857 اور اس سے قبل کی جو تحریکیں انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے مختلف حصوں میں چل رہی تھیں ان کا حیدرآباد سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہا۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جدوجہد آزادی 1857 کی تحریک میں حیدرآباد نے صرف ایک تماشائی کا رول ادا نہیں کیا تھا۔ اس موقع پر یہاں کے نازک حالات میں عوام نے انگریزوں کے اقتدار کے خلاف جس غم وغصہ کا اظہار کیا تھا اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

افضل الدولہ (1857 تا 1869) اپنے والد ناصرالدولہ آصف رابع (چہارم) کے انتقال پر 1857 کی جنگ آزادی کے دوران تخت نشیں ہوئے۔ اس لیے انھیں نازک اور پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ حیدرآباد میں بڑے پیمانے پر بغاوت رونما نہیں ہوئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی عوام انگریز مخالف جذبات رکھتے تھے اور شمالی ہندوستان میں ہونے والے واقعات کی تفصیلات سن کر وہ چاہتے تھے کہ افضل الدولہ آصف خامس (پنجم) اور مدارالمہام (وزیراعظم) سالار جنگ اول بیرونی تسلط کے خاتمے کے لیے جدوجہد میں شامل ہوجائیں۔ افضل الدولہ کے تخت نشیں ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد یہاں یہ اطلاع پہنچی کہ دہلی میں جنگ آزادی کا آغاز ہوچکا ہے تو دارالخلافہ شہر حیدرآباد میں عوام کی انگریز مخالف سرگرمیاں ظاہر ہونے لگیں۔ شہر حیدرآباد میں چند چھوٹے موٹے واقعات ہوئے لیکن 17 جولائی 1857 کو رزیڈنسی پر حملہ پہلا اور آخری بڑا واقعہ تھا جو شہر حیدرآباد میں پیش آیا۔ رزیڈنسی پر حملہ آوروں کے لیڈر طرہ باز خاں گرفتار کرلیے گئے۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ طرہ باز خاں جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے لیکن توپران دیہات کے قریب پکڑے گئے اور فرار ہونے کی کوشش پر نائب توپران نے انھیں گولی ماردی۔ مولوی علاء الدین جو رزیڈنسی پر حملہ کرنے میں طرہ باز خاں کے ساتھ حملہ آوروں کی قیادت کررہے تھے حملے کی ناکامی کے بعد بنگلور فرار ہوگئے۔ انھیں بنگلور کے ایک دیہات منگلاپلی میں گرفتار کیا گیا اور وہاں سے انھیں حیدرآباد لایا گیا۔ ان پر مقدمہ چلا اور انھیں جزیرہ انڈمان میں حبس دوام کاٹنے کی سزا دی گئی جو اس زمانے میں سزائے موت کے بعد سب سے سخت سزا سمجھی جاتی تھی۔ تمام تحقیقی کتابوں Who is who، Freedom Struggle in Hyderabad جلد دوم، Nizam Birtish اور in Andhra Pradesh جلد اول Relations میں مولوی علاء الدین کا سنہ وفات 1884 لکھا گیا ہے۔ مزید برآں ان کتابوں سے مولوی علاء الدین کی زندگی کے اس طویل عرصے کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو مولوی صاحب نے جزائر انڈمان میں گزارا تھا۔

آندھراپردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے آصف جاہی ریکارڈ میں راقم الحروف کو ریاست حیدرآباد کی متعدی عدالت کی ایک مسل (مسل نشان 445 بابت 1298 ص، عدالت ومتفرق) دستیاب ہوئی ہے جو مولوی صاحب کی زندگی کے ان پہلوؤں سے پردہ ہٹاتی ہے جو اب تک تاریکی میں تھے۔ اس مسل سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مولوی علاء الدین 1889 تک حیات تھے۔ علاوہ ازیں اس بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ مولوی صاحب نے اپنی رہائی کے سلسلے میں کیا کوششیں کی تھیں، ان کی رہائی کے بارے میں حکومت ہند اور حکومت ریاست حیدرآباد کی جانب سے کیا اقدامات کیے گئے تھے، پورٹ بلیر میں 1860 تا 1889 یعنی تقریباً تیس سال مولوی علاء الدین کی کیا مصروفیات ہیں اور اس دوران ان کی صحت کیسی رہی؟ اس مسل میں حکومت حیدرآباد کے نام مولوی علاء الدین کی پیش کردہ اصل فارسی درخواست، درخواست کے ساتھ منسلک کردہ ڈاکٹروں کے طبی تصدیق نامے اور عہدیداروں کی توصیفی اسناد موجود ہیں۔ مولوی صاحب کی اس درخواست پر حکومت حیدرآباد کی جانب سے کیا کارروائی کی گئی تھی اس سے متعلق کاغذات بھی اس مسل میں موجود ہیں۔ اس مسل کی تمام کارروائی کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مولوی علاء الدین اپنی فارسی درخواست مورخہ 29 جمادی الاول 1306 یکم فروری 1889 میں لکھتے ہیں کہ 1857 میں حیدرآباد رزیڈنسی پر حملہ کرنے کے جرم میں عمر قید کی سزا دے کر انھیں پورٹ بلیر بھیج دیا گیا جہاں وہ تقریباً تیس سال کا عرصہ گزار چکے ہیں اور یہاں اپنی آمد سے لے کر اب تک وہ کسی قصور کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔ تمام حکام ان سے رضامند رہے

اور اکثر نے خوشنودی کے تصدیق نامے بھی عطا کیے ہیں۔ چونکہ یہاں قیدیوں کی رہائی مطلق کے لیے بیس سال کی مدت مقرر ہے اس لیے ہزارہا قیدی جو مختلف جرموں کی پاداش میں یہاں سزا بھگت رہے تھے مدت معینہ کی تکمیل کے بعد رہا ہو کر اپنے وطن لوٹ چکے ہیں یا لوٹ رہے ہیں لیکن وہ اپنے حسنِ سلوک اور تقریباً تیس سال کی مدت گزارنے کے باوجود یہیں پر موجود ہیں۔

سابق میں ان کی رہائی کے سلسلے میں جو کارروائیاں ہوئی تھیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ 1877 میں حکومت ہند نے ان کی رہائی مطلق کے لیے حکومت حیدرآباد کو لکھا تھا لیکن بدقسمتی سے اس وقت ریاست کے مدارالمہام سالار جنگ اول نے جو ایک عرصے سے مولوی صاحب سے ناخوش تھے، اس تجویز کو نامنظور کر دیا۔ چنانچہ حکومت ہند نے انھیں اس جزیرے کی حد تک رہائی عطا کی۔ ان کی رہائی کے لیے حکومت ہند کی جانب سے کی جانے والی سرکاری کارروائی کے بارے میں مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ تقریباً تین سال قبل حکومت ہند کے معتمد داخلہ مسٹر میکنزی دورے کی غرض سے پورٹ بلیر آئے تھے اور اتفاقاً مولوی صاحب کی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ چیف کمشنر نے ان کی تمام سرگزشت معتمد داخلہ کو سنائی اور معتمد داخلہ نے مولوی صاحب سے بھی استفسارات کیے اور وعدہ کیا کہ وہ کلکتہ پہنچ کر مولوی صاحب کی رہائی مطلق کے بارے میں حکومت ہند کو رپورٹ پیش کریں گے۔ چنانچہ معتمد داخلہ نے حسب وعدہ رپورٹ پیش کی جسے گورنر جنرل نے غور و خوض کے لیے کونسل میں پیش کیا۔ جب یہ معاملہ کونسل میں پیش ہوا تو کونسل نے طے کیا کہ مولوی صاحب کو آزادیِ مطلق دی جانی چاہیے۔

گورنر جنرل نے ان کی رہائی مطلق کی اجازت کے حصول کے لیے کونسل کی تجویز حکومت ریاست حیدرآباد کو روانہ کی۔ لیکن ریاست کے مدارالمہام سالار جنگ دوم نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا اور تجویز حکومت ہند کو واپس کر دی۔ اس طرح حکومت ہند کی دونوں تجاویز حکومت حیدرآباد کی جانب سے نامنظور کر دی گئیں۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے چیف کمشنر اور ڈاکٹروں کی سفارشات کے ساتھ حکومتِ ہند کو درخواست پیش کی تھی جس میں انھوں نے استدعا کی تھی کہ انھیں ہندوستان واپس ہونے کی اجازت مرحمت کی جائے لیکن حکومت ہند نے یہ کہتے ہوئے ان کی درخواست نامنظور کر دی کہ حکومت ریاست حیدرآباد کی اجازت کے بغیر ان کی رہائی مطلق ممکن نہیں۔ حکومت ہند کے اس موقف کے پیشِ نظر مولوی صاحب کو اپنی رہائی کے لیے براہ راست حکومت حیدرآباد سے رجوع ہونا پڑا۔ چنانچہ اوپر بیان کردہ تفصیلات کے بعد وہ اپنی درخواست میں لکھتے ہیں کہ وہ اس جزیرے میں تقریباً تیس سال کی مدت گزار چکے ہیں۔ جب وہ اس جزیرے پر پہنچے تھے اس وقت وہ جوان، تندرست اور قوی ہیکل تھے لیکن اب وہ کافی ضعیف ہو چکے ہیں اور کئی امراض میں مبتلا ہیں۔ ان کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ پانچ وقت کی نماز بیٹھ کر اشاروں سے پڑھتے ہیں اور کسی کی مدد کے بغیر ان کا حرکت کرنا مشکل ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی درخواست کے ساتھ جو طبی تصدیق نامے منسلک کیے ہیں ان سے ان کی طبی حالت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی درخواست کے آخر میں رہائی مطلق کی منظوری عطا کرنے کی استدعا کی تاکہ وہ اپنی عمر کی بقیہ قلیل مدت گوشۂ گمنامی میں خدائے تعالیٰ کی عبادت اور دعائے خیر میں صرف کر سکیں۔

مولوی صاحب نے درخواست کے ساتھ 8 طبی تصدیق نامے منسلک کیے تھے۔ یہ تصدیق نامے جونیئر اور سینئر میڈیکل آفیسروں کی جانب سے 1886 اور 1889 کے دوران جاری کیے گئے تھے۔ ان تصدیق ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی علاء الدین کئی امراض میں مبتلا تھے مثلاً گٹھیا، double inginal hernia وغیرہ۔ ضعیفی کی وجہ سے ان کی بصارت بہت کمزور ہوگئی تھی۔ بہت پہلے بندوق کی گولی لگنے کی وجہ سے وہ سیدھے بازو سے معذور ہو گئے تھے۔ ان کی پیشانی پر زخم کا نشان تھا اور کندھے پر تلوار کے وار کا گہرا زخم تھا۔ تقریباً سبھی ڈاکٹروں کی یہ رائے تھی کہ مولوی صاحب اس مقام سے واپس ہونے کے لیے بے چین ہیں اس لیے انھیں تبدیلیِ مقام کی اجازت دی جانی چاہیے تاکہ ان کی صحت بہتر ہو سکے، ان کے مصائب میں کمی اور عمر میں اضافہ ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورٹ بلیر کے تمام عہدیدار مولوی علاء الدین سے بے حد خوش تھے اور ان سے ہمدردی رکھتے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی درخواست کے ساتھ 44 توصیفی اسناد بھی منسلک کی تھیں جو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ، ایگزکٹیو انجینئر اور پولیس ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کی جانب سے جاری کی گئیں تھیں۔ یہ تصدیق نامے مولوی علاء الدین کے بارے میں اہم اور بالکل نئی معلومات مہیا کرتے ہیں۔ ان کے مطابق مولوی صاحب 22 جنوری 1860 کو پورٹ بلیر پہنچے تھے اور بحیثیت قیدی ان کا نمبر 3708 تھا۔ چونکہ وہاں فارسی جاننے والوں کی کمی تھی اس لیے انھوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور تین مختلف ڈیویژنوں میں محرر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس علاقے میں بڑے پیمانے پر کاشت کاری کے لیے بھی ان کا تعاون حاصل رہا۔ انھوں نے وہاں آٹے کی گرنی کھولی تھی اور دودھ کی فراہمی کے لیے گلہ حاصل کیا تھا۔ مولوی صاحب نے ساجھے داری میں ایک دکان بھی کھولی تھی۔ انگریز عہدیداروں نے اپنے تصدیق ناموں میں ان کی دیانت داری کی اچھے الفاظ میں تعریف کرتے ہوئے ضرورت کی اشیاء ان کی دکان سے خریدنے کی سفارش بھی کی تھی۔ بعض انگریز عہدیداروں نے فارسی سیکھنے کے لیے انھیں اپنا استاد مقرر کیا تھا۔ جن عہدیداروں نے تصدیق نامے جاری کیے تھے وہ سب اس بارے میں متفق الرائے تھے کہ

مولوی علاء الدین ایک بے حد با اخلاق، نہایت شائستہ، خاصے پڑھے لکھے اور ذہین شخص تھے۔ بہت سے تصدیق ناموں میں ان کی رہائی مطلق کے بارے میں بھی سفارش کی گئی تھی۔

مولوی علاء الدین کی اس درخواست پر حکومت حیدرآباد کی جانب سے جو کارروائی کی گئی تھی اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عماد جنگ معتمد عدالت حکومت ریاست حیدرآباد نے اپنے نوٹ میں مولوی صاحب کی درخواست کا خلاصہ اور ان کی استدعا بیان کرتے ہوئے لکھا کہ مولوی صاحب نے اپنی درخواست کے ساتھ جو کاغذات روانہ کیے ہیں ان سے ان کی بیماری کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس مدت میں ان کا رویہ اچھا رہا ہے۔ اگرچہ یہ حکم جاری ہو چکا ہے کہ عمر قید کی سزا بھگتنے والے قیدی بیس سال تک چال چلن نیک رہنے کی صورت میں رہا کر دیے جائیں، مولوی علاء الدین نے تیس سال تک نیک چلنی کا ثبوت دیا ہے لیکن اس مقدمے کا انگریزی حکومت سے تعلق ہے۔ اگر اجازت ہو تو صاحب عالی نشان کو لکھا جائے کہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا کو ان کی رہائی میں اعتراض نہ ہو تو ان کی رہائی کا حکم صادر کیا جائے۔ معین المہام (وزیر) عدالت فخر الملک نے معتمد عدالت کی تجویز سے اتفاق کیا۔ مدارالمہام سر آسمان جاہ نے اس نوٹ پر استفسار کیا ''مولوی علاء الدین کی عمر اب کس قدر ہوگی؟''۔ اس استفسار کے جواب میں عماد جنگ نے لکھا کہ مولوی صاحب کی درخواست میں ان کی عمر نہیں لکھی گئی ہے لیکن بعض ڈاکٹروں کے سرٹیفکیٹ سے جو ان کی درخواست کے ساتھ منسلک ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر تقریباً 67 برس کی ہے اور اکثر ڈاکٹروں نے لکھا ہے کہ اب وہ بہت ضعیف ہو گئے ہیں اور ان کی بصارت میں فرق آ گیا ہے۔ جن کاغذات پر نشان لگائے گئے ہیں اگر وہ ملاحظہ کیے جائیں تو ثابت ہوگا کہ وہ قابل رحم ہیں۔ آسمان جاہ نے ان پر رحم کھانے کی بجائے یہ حکم تحریر کر دیا کہ مولوی صاحب کو جواب دیا جائے کہ جس علاقے میں وہ رہتے ہیں وہاں درخواست پیش کریں۔ اگر وہاں سے کارروائی پیش ہوگی تب لحاظ کیا جائے گا۔ مولوی صاحب کو ایک مراسلہ مورخہ 17 شوال 1306 ہجری مطابق 17 جون 1889 کے ذریعے اس حکم سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس طرح مولوی صاحب آخری کوشش میں بھی رہائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آرکائیوز کی مسل سے جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی روشنی میں اب وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی علاء الدین کا انتقال 1884 میں نہیں ہوا تھا جیسا کہ مذکورہ بالا چند تحقیقی کتابوں میں لکھا گیا ہے بلکہ وہ 1889 تک حیات تھے۔ وہ رہائی مطلق اور اپنے وطن آنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ انھوں نے ابتدائی کوششوں میں ناکامی کے بعد حکومت ریاست حیدرآباد کو ایک درخواست روانہ کی تھی جس کے ساتھ طبی صداقت نامے اور توصیفی اسناد منسلک تھے لیکن اس بار بھی ان کی کوشش رائیگاں گئی۔ مولوی صاحب نے اپنی درخواست کے ساتھ جو منسلکات روانہ کیے تھے ان سے نہ صرف ان کی صحت کے بارے میں علم ہوتا ہے بلکہ پورٹ بلیر کی ان کی 30 سالہ زندگی کی مصروفیات اور سرگرمیوں کا ایک خاکہ بھی سامنے آتا ہے۔

□□□

پتہ:
16-2-741/B15,
Asmangarh, Malakpet
Hyderabad-500036 (A.P.)

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

سید امتیاز الدین

طرّہ باز خاں

عام طور پر جب ہمارے ملک کی جنگِ آزادی کی تاریخ بیان کی جاتی ہے تو سب سے پہلے 1857 کی وہ خونیں داستان یاد آتی ہے جسے عرفِ عام میں غدر کا نام دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ 1857 سے بھی بہت پہلے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبات مشتعل ہو چکے تھے۔ نہ صرف شمالی ہند بلکہ دکن کے عوام بھی انگریزوں سے شدید نفرت کرنے لگے تھے۔ ریاست حیدرآباد میں بھی بے چینی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ نظامِ حیدرآباد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین 1853 میں ایک معاہدہ طے پایا تھا جس کی رو سے ریاستِ حیدرآباد کے اضلاع برار، عثمان آباد اور رائچور نظامِ حیدرآباد کی حفاظت پر مامور فوجوں کے خرچ کی پابجائی کے لیے انگریزوں کو دے دیے گئے تھے۔ انھی دنوں ریاست کے وزیرِ اعظم سراج الملک کی وفات واقع ہوئی اور سالار جنگ اول ان کی جگہ ریاست کے دیوان مقرر ہوئے۔ نظام چہارم ناصر الدولہ کا انتقال بھی اُسی زمانے میں ہوا۔ عوام میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ ناصر الدولہ طبعی موت نہیں مرے بلکہ ان کو سازش کے تحت مارا گیا ہے۔ برار کی انگریزوں کو حوالگی سے بھی عوام میں سخت بے چینی تھی۔ شمالی ہند سے بھی ایسی خبریں مل رہی تھیں کہ انگریزی فوجیں شکست کھا رہی ہیں اور ہندوستانی مجاہدینِ آزادی پیش قدمی کر رہے ہیں۔ حیدرآباد کی مساجد میں مولویوں کی جوشیلی تقاریر ہونے لگی تھیں اور ولولہ انگیز اعلامیے (پوسٹر) دیواروں پر چسپاں کیے جا رہے تھے جن میں عوام کے ساتھ ساتھ فرماں روائے وقت نظامِ پنجم افضل الدولہ سے بھی کہا گیا تھا کہ اُن کو انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا چاہیے۔ اللہ و رسول کی مدد ان کے ساتھ ہے۔ اس لیے اُن کو انگریزوں سے ڈرنا یا خائف ہونا نہیں چاہیے۔ اگر انھیں ڈر ہے تو پھر انھیں چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھ جانا چاہیے۔

انھی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو حیدرآباد میں ریزیڈنٹ کی قیام گاہ ریزیڈنسی پر حملے کا باعث ہوا۔ جس میں مجاہدِ آزادی طرہ باز خاں اور اُن کے ساتھیوں نے دادِ شجاعت دی اور تاریخ کے صفحات پر ان کا نام ہمیشہ کے لیے رقم ہو گیا۔ ریزیڈنسی پر حملے کا پس منظر یوں ہے کہ اورنگ آباد کی انگریزی چھاونی میں بھی انگریزوں کے خلاف سخت نفرت آمیز جذبات پائے جاتے تھے۔ سپاہیوں میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ انھیں شمالی ہند میں پھیلی ہوئی بغاوت کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا جانے والا ہے۔ ان فوجیوں نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ ہم کو یہیں خدمات انجام دینے کے لیے رکھا گیا ہے اور ہم اپنے بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کے خلاف انگریزوں کی مدد کے لیے شمالی ہند نہیں جائیں گے۔ اورنگ آباد کی بغاوت کا ایک اہم رہنما چیدہ خاں تھا جو انگریزوں کے چنگل سے نکل کر اس امید میں اپنے تیرہ ساتھیوں کے ساتھ حیدرآباد پہنچا کہ شاید یہاں اسے پناہ مل جائے۔ چیدہ خاں کی گرفتاری پر پہلے سے ہی تین ہزار روپے انعام کا اعلان ہو چکا تھا۔ جونہی چیدہ خاں اور اس کے ساتھی حیدرآباد پہنچے وزیرِ اعظم سالار جنگ نے انھیں گرفتار کر کے انگریز ریزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن کے حوالے کر دیا۔ اس واقعے سے شہر حیدرآباد میں سخت تناؤ اور بے چینی پھیل گئی۔

17 جولائی 1857 کو جمعے کے دن زبردست احتجاجی جلسہ مکہ مسجد میں منعقد ہوا جس میں طے کیا گیا کہ چار مولویوں کو لے کر نظامِ دکن کی خدمت میں جائیں اور ان سے کہا جائے کہ وہ چیدہ خاں اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیں اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا جائے۔ جونہی یہ خبر سالار جنگ کو پہنچی انھوں نے عرب جمعیت کا ایک جتھا ریزیڈنسی کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔ مکہ مسجد سے یہ جلوس مولوی علاء الدین کی قیادت میں روانہ ہوا جب یہ جلوس بیگم بازار کے محلے کی طرف پہنچا تو طرہ باز خاں اور ان کے ساتھی بھی اس جلوس میں شامل ہو گئے۔

طرّہ باز خاں کے والد کا نام رستم خاں تھا۔ وہ ایک بہادر پٹھان اور ذی حیثیت آدمی تھے۔ کئی روہیلے اور پٹھان ان کے ملازم تھے۔ قریب ساڑھے پانچ بجے یہ جلوس ریزیڈنسی پر حملہ آور ہوا۔ چونکہ ریزیڈنٹ حالات سے پوری طرح باخبر ہو چکا تھا اس لیے اس نے میجر برگس اور میجر برایس کی سرکردگی میں اپنی فوج اور اسلحہ کی بہترین صف آرائی کر لی تھی۔ ریزیڈنسی کے سامنے دو مکانات تھے۔ ایک مکان ابن صاحب (نواب فیاض یار جنگ) کا تھا اور دوسرا جنے گوپال داس کا۔ ریزیڈنسی پر حملے سے پہلے ان مجاہدین نے ان دونوں مکانات پر قبضہ کر لیا تاکہ وہاں سے ریزیڈنسی کے اندرونی حصوں اور اہم مقامات پر حملہ کر سکیں۔ طرہ باز خاں کی سرکردگی میں روہیلوں نے ریزیڈنسی کا دروازہ توڑ دیا اور حملہ کر دیا۔ شام چھ بجے سے دوسری صبح کے چار بجے تک حملے جاری رہے۔ انگریزوں کی فوج تربیت یافتہ تھی اور گولہ بارود کا ذخیرہ بھی ان کا زیادہ تھا۔ کئی مجاہدین ہلاک یا زخمی ہوئے۔ دوسری صبح فجر کے بعد طرہ باز

خاں اپنے ساتھیوں اور زخمیوں کو لے کر بیگم بازار لوٹ گئے۔ عرب جمیعت نے اس موقع پر چشم پوشی سے کام لیا جس کی وجہ سے مجاہدین فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ اس حملے کے بعد انگریزوں نے این صاحب اور جے گوپال داس کے مکانوں کو مسمار کردیا اور ریزیڈنسی کو فوجی لحاظ سے اور مضبوط کردیا۔

18 جولائی 1857 کو ریزیڈنٹ ڈیوڈسن نے نظام حیدرآباد کو لکھا کہ باغیوں کو جلد از جلد گرفتار کرلیا جائے۔ ریاستِ حیدرآباد کی پولیس اور فوج کو اس سلسلے میں چوکس کردیا گیا۔ طرہ باز خاں کو محمد بڈھن خاں نامی شخص کے سواروں نے گرفتار کرلیا اور ان کی جائیداد کو ضبط کرلیا گیا۔

22 جولائی 1857 کو سالار جنگ نے ریزیڈنٹ کو مطلع کیا کہ طرہ باز خاں کو گرفتار کرلیا گیا ہے لیکن وہ ابھی شدید زخمی ہیں۔ کرامت علی مجسٹریٹ فوجداری فضل اللہ مجسٹریٹ دیوانی اور غالب جنگ نے ان کا بیان قلم بند کیا۔ طرہ باز خاں نے بڑی دلیری سے اس بات کا اعتراف کیا کہ انھوں نے اس بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اور باغیوں کو جانتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ وہ اپنے گھر پر تھے۔ جلوس وہاں سے گزرا جہاد کا علم بلند تھا اور وہ اس علم کو دیکھ کر جہاد کی نیت سے اس میں کود پڑے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا انھیں اس بغاوت میں شامل ہونے کے لیے کسی نے ورغلایا تھا تو انھوں نے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے اس حملے میں شریک ہوئے تھے۔ اس مجاہد آزادی نے شدید زخمی حالت میں بھی جس دلیری اور حق گوئی کے ساتھ اپنا بیان قلم بند کروایا اور اپنا جرم قبول کیا۔ طرہ باز خاں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ ریزیڈنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا کہ طرہ باز خاں کا جرم اتنا سنگین ہے کہ ان کو سزائے موت دی جانی چاہیے لیکن گورنر جنرل نے سزا کو تبدیل کرنے سے انکار کردیا۔ 18 جنوری 1859 کو طرہ باز خاں حراست سے فرار ہوگئے اور ان کے ساتھ ہی جیل کے دو سپاہی بھی جنھوں نے طرہ باز خاں کی فراری میں مدد دی تھی جیل سے فرار ہوگئے۔ 19 جنوری 1859 کو طرہ باز خاں کی گرفتاری پر پانچ ہزار روپئے کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ ایک ہفتے کے اندر قربان علی نامی ایک شخص نے طرہ باز خاں کو گرفتار کرلیا۔ قربان علی، محمد خاں جمعدار اور چند لوگوں کو لے کر اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں طرہ باز خاں چھپے ہوئے تھے۔ قربان علی نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے طرہ باز خاں کو ان کی آنکھ کے نیچے زخم کے نشان سے پہچانا۔ قربان علی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر طرہ باز خاں اور ان کے جاں نثاروں نے تلواریں سونت لیں جس پر قربان علی اور اس کے ساتھیوں نے گولیاں چلادیں۔ طرہ باز خاں اور ان کے ساتھی ہلاک ہوگئے۔ طرہ باز خاں کے تین ساتھی جنگل میں فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ قربان علی نے طرہ باز خاں کی لاش غلام حیدر، بابولعل اور ان کے ساتھیوں کے ذریعے حیدرآباد بھیج دی۔ طرہ باز خاں کی لاش کو زنجیروں سے باندھ کر شہر حیدرآباد میں برسرِ عام لٹکایا گیا۔

آندھرا پردیش کے سابق گورنر بھیم سین سچر نے ریزیڈنسی (جہاں آج کل ویمینس کالج قائم ہے) سے متصل سڑک کا نام طرہ باز خاں روڈ رکھا۔ یہیں اس شہیدِ آزادی کا مجسمہ بھی نصب ہے۔

□□□

پتہ:
3-5-805,
Hyderguda,
Hyderabad-500029(A.P.)

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالاتِ زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت -/258 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی- 066 110

لطیف حسین ادیب

شہزادہ فیروز شاہ

جنگ آزادی 1857 کے مجاہدین کی طویل فہرست میں ایک اہم نام شہزادہ فیروز شاہ کا ہے جو شمالی ہندوستان کے جنگی میدان میں ہر محاذ پر نظر آتے ہیں۔ ان کا اپنا جاسوسی نظام تھا، اپنی فوج تھی اور وہ دشمن پر اچانک حملہ کرکے اس کو نقصان پہنچاتے اور کسی خطرے میں پھنسنے سے قبل میدان کارزار سے فرار ہوجاتے تھے۔ وہ گوریلا جنگ کے ماہر تھے۔ گوریلا جنگ کے علاوہ بھی انھوں نے مجاہدین آزادی کا جگہ جگہ ساتھ دیا اور انگریزی فوج کو نقصان پہنچایا۔ وہ 1857 کی جنگ آزادی میں آخری لمحات تک انگریزوں سے لڑتے رہے اور انگریزوں کے بہترین جاسوسی نظام کے باوجود ان کے ہاتھ نہیں آئے۔ 1857 کی جنگ آزادی کے اوراق میں ان کے واقعات بکھرے ہوئے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان کو منضبط کرکے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فیروز شاہ مغل شاہزادے تھے۔ انگریزوں نے ان کو غلطی سے شاہ ظفر کا بیٹا تحریر کیا ہے۔ (فریڈم اسٹرگل 5/381)۔ فیروز شاہ، شاہ عالم ثانی (م 1706) کے پوتے مرزا کاظم کے بیٹے تھے (قادری۔ 274)۔ اس طرح وہ شاہ ظفر کے چچازاد تھے۔ شہزادہ فیروز شاہ آگرہ میں مقیم تھے اور آگرہ میں ہی ان کی جائیداد تھی۔ وہ 1857 کی جنگ آزادی سے قبل حج بیت اللہ شریف کو گئے تھے اور واپس آکر جنگ آزادی میں شریک ہوگئے۔ (فریڈم اسٹرگل 5/378)۔ وہ جب حج بیت اللہ شریف سے فارغ ہوکر ممبئی سے آگرے کے لیے روانہ ہوئے، اثنائے راہ لوگوں کو بغاوت پر اکساتے رہے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تقاریر کیں۔ اس کوشش کے نتیجے میں انھوں نے گوالیار میں ایک فوجی دستہ تیار کرلیا جو اس قدر جوش میں بھرا ہوا تھا کہ جنگی مصلحتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے آگرے میں 10 اکتوبر 1857 کو انگریزوں پر دھاوا بول دیا۔ انھیں شکست ہوئی لیکن دشمن کا بھی بھاری جانی نقصان ہوا۔ شہزادہ فیروز شاہ کی جائیداد برباد ہوگئی اور ان کے افراد خاندان منتشر ہوگئے (فریڈم اسٹرگل 5/378)۔ شہزادہ فیروز شاہ اس شکست کو بھلا نہیں سکے۔ انھوں نے سقوط روہیل کھنڈ کے بعد نواح آگرہ میں چندن پور (اٹاوہ) کے قلعے پر حملہ کیا تھا لیکن سیف اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر آگرہ کی فوج کے مقابلے میں پسپا ہوکر میدان کارزار سے فرار ہوگئے تھے۔ (قادری۔ 274)۔

20 ستمبر 1857 کو انگریزوں نے دہلی پر مکمل قبضہ کرلیا تھا۔ اس کے بعد مجاہدین مغربی یوپی کے اضلاع میں انگریزوں سے جنگ کررہے تھے۔ بریلی میں نواب حافظ رحمت خاں روہیلہ (م 1774) کے پوتے نواب خان بہادر خاں انگریزوں کے خلاف مجاہدین کی قیادت کررہے تھے۔ شاہ ظفر نے ان کو کیٹھر یعنی روہیل کھنڈ کی نظامت کا فرمان بھیجا تھا۔ روہیل کھنڈ کے انقلابی رہنماؤں کی آمد و رفت بریلی میں جاری تھی اور ان کا نواب خان بہادر سے رابطہ قائم تھا۔ نواب خان بہادر خاں نہایت بیدار مغزی سے انقلابی حکومت چلارہے تھے۔ انھوں نے فوج بھرتی کی، ٹکسال قائم کی، اسلحہ سازی کی فیکٹری قائم کی، مالداروں کی آمدنی پر 10 فیصدی ویلتھ ٹکس لگایا تاکہ انقلابی حکومت کی مالی کمزوری رفع ہو، شہر میں امن و اماں قائم کیا اور انقلابی حکومت کے مقاصد اور عزائم کو مشتہر کرنے کے لیے، مولوی قطب شاہ استاذ فارسی بریلی کالج بریلی نے مطبع بہادری قائم کیا جس میں انقلابی حکومت کے اشتہار طبع کرکے شائع کیے جاتے تھے۔ شہزادہ فیروز شاہ نے ایک تاریخی اہمیت کا اشتہار تحریر کرکے مطبع بہادری سے شائع کرایا تھا جس کے آخر میں یہ عبارت درج تھی۔ ''مطبع بہادری۔ بحکم ناظم کھیٹر۔ زیرنگرانی مولوی قطب شاہ۔ طابع شیخ نیاز علی۔ مورخہ 3 رجب 1274 ہجری مطابق 18 فروری 1858۔'' اس اشتہار کا انگریزی میں ترجمہ ایف بی اوٹرم۔ اسسٹنٹ سکریٹری (F.B. Ontram, Assistant Secondary) نے کیا تھا (فریڈم اسٹرگل 5/376 to 381)۔ اس ترجمے کی وجہ سے یہ اشتہار محفوظ ہوگیا۔ اس اشتہار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام انگریزوں سے کس قدر متنفر اور بیزار تھے اور بوجوہ ان کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے تھے۔ نواب خان بہادر خاں کی انقلابی حکومت کی پالیسی قطعاً غیر جانبدارانہ تھی اور وہ ملک کے ہر فرد کے دین، عزت اور ناموس کے لیے انگریزوں کی حکومت کو خطرہ سمجھتے تھے۔ اس اشتہار میں 15 ایسے نکات بیان کیے گئے ہیں جو انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے دین و مذہب، روزمرہ کی زندگی، رسوم، روایات اور مالی حالت کو تباہ کرنے کے لیے تیار کیے تھے۔ انگریزوں کے اس منصوبے کا ذکر کرکے، اس اشتہار کے ذریعے، اہل وطن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنا اپنا دین بچانے اور اپنی اپنی جان و عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے یوروپیاوں کو قتل کریں۔ اس اشتہار میں انگریزوں کے خلاف لڑائی کو جہاد سے اور بلا تفریق و مذہب انگریزوں سے جنگ کرنے والوں کو مجاہد سے موسوم کیا گیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں کو حوصلہ بلند رکھنے اور پایان کار کامیابی کی امید دلائی گئی تھی۔ انگریزوں کے لیے عیسائی اور کافر کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ یہ اشتہار عام لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر ان کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کرنے کے لیے تحریر کیا گیا تھا۔ اس اشتہار سے شہزادہ فیروز شاہ کی ذہنی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انگریز دشمنی میں کس حد تک بڑھے ہوئے تھے۔ وہ تلوار کے ساتھ اپنے قلم سے بھی انگریزوں کے خلاف مورچہ بند تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سقوط دہلی سے پہلے ہی شہزادہ فیروز شاہ کا دہلی سے قطع تعلق ہوگیا تھا۔ شاہ ظفر کی اولاد اور پھر اولاد کی اولاد کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ اس ہجوم میں شاہ ظفر کے چچا کی اولاد کی قلعے میں سمائی اور ان کی پہچان ممکن نہیں تھی۔ شہزادہ فیروز شاہ اپنے عیال کے ساتھ آگرے میں مقیم ہوئے تھے۔ 10 اکتوبر 1857 کی جنگ کے بعد وہ جائیداد سے محروم ہوگئے اور بے گھر اور بے وطن ہونے کے بعد جنگِ آزادی میں ہمہ وقتی شریک ہوگئے۔ ان کی بیٹی ریاست رامپور میں تھیں، جن کے بیٹے خارج فانتوم تھے۔ وہ برنارڈ فانتوم کے پسر تھے۔ برنارڈ فانتوم ایک فرانسیسی فوجی افسر اور ڈاکٹر تھا جو نواب احمد علی خاں (م 1840) کے علاج کے لیے حیدرآباد سے رامپور آیا تھا۔ اس کی وفات رامپور میں 1845 کو ہوئی تھی۔ (انتخاب یادگار

189)۔ جارج فانتوم نے علمائے وقت سے کسب علم کیا۔ فارسی و اردو زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے ایک مختصر تذکرۂ شعرائے رامپور بھی تالیف کیا تھا جس کا مخطوطہ رامپور رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ ان کی بیوی کا نام حاجیہ بیگم تھا۔ مدرسہ اشاعت العلوم سرائے فام بریلی کے منیجر قاری عبدالعزیز ماجیہ بیگم کے نواسے تھے۔ جارج فانتوم اور حاجیہ بیگم کی قبور بریلی کالج بریلی میں ہیں۔ فانتوم گنج کی جائیداد اکبر شاہ ثانی (م 1837) نے کپتان برنارڈ فانتوم کو عطا کی تھی (تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ 3/2132)۔ اس طرح شہزادہ فیروز شاہ کی بریلی سے نسبت بہت قریبی تھی اور ان کا بریلی میں آنا، اشتہار شائع کرانا اور نواب خان بہادر خاں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونا اس نسبت کا ثبوت ہیں۔

شہزادہ فیروز شاہ نے اپنی زندگی انگریزوں سے جنگ کرنے اور ان کو زک پہنچانے کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کا گھر میدان جنگ ان کا بستر گھوڑے کی زین اور ان کی رفیق و دمساز تیغ خوں آشام تھی۔ انھوں نے صرف مغربی یوپی کے اضلاع روہیل کھنڈ میں انگریزوں کے خلاف درجنوں محاربات کیے۔ خاص طور پر مرادآباد، سنبھل، شاہ جہاں پور، بدایوں اور بریلی میں ان کی انگریزوں سے لڑائیاں 1857 کی تاریخ کے یادگار واقعات ہیں۔ ان کی جنگی حالت یہ تھی کہ جب انگریز کسی مقام پر قبضہ کر کے پیش قدمی کرتے، وہ اسی مقام پر حملہ کر کے انگریزوں کو نقصان پہنچاتے تھے۔ ان کے حملے میں انگریزی فوج کو بھاری نقصان ہوتا اور قبل اس کے انگریزی فوج سنبھل کر ان پر حملہ کرے، وہ میدان کارزار سے فرار ہو جاتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی دو لڑائیوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

مرادآباد پر ریاست رامپور کی فوج کے سربراہ عبدالعلی خاں نے قبضہ کرلیا تھا۔ مرادآباد کے انتظام کا اختیار انگریزوں نے نواب یوسف علی خاں کو دے دیا تھا۔ انگریز حکام نینی تال میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ 22 اپریل 1858 کو فیروز شاہ نے مرادآباد پر اچانک حملہ کیا۔ عبدالعلی خاں کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ رامپور بھاگ گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ نے سرکاری دفاتر اور بنگلوں کو لوٹا، خزانے پر قبضہ کیا، سرکاری املاک میں آگ لگادی اور قبل اس کے کہ انگریزی فوج تادیبی کارروائی کرے، جو وہاں سے دو منزل کے فاصلے پر تھی، انھوں نے شاہ جہان پور اور اودھ کی جانب روانگی اختیار کی۔ (فریڈم اسٹرگل 444، 427، 407)

شہزادہ فیروز شاہ کی دوسری یادگار جنگ ککرالہ ضلع بدایوں میں ہوئی تھی۔ بریگیڈیر پنی نے 20 اپریل 1858 کو اسہیت (تحصیل داتا گنج، ضلع بدایوں) پر قبضہ کرلیا تھا۔ ککرالہ پرگنہ اسہیت میں واقع ہے۔ بریگیڈیر پنی کو طے شدہ پلان کے مطابق ککرالہ سے شاہ جہان پور جا کر جنرل کیمبل کمانڈر ان چیف کی سربراہی میں بریلی پر حملہ کرنا تھا۔ لیکن شہزادہ فیروز شاہ اور وزیر محمد خاں صبح کی ہلکی روشنی میں ان پر حملہ آور ہوئے۔ بریگیڈیر پنی مارا گیا۔ شہزادہ فیروز شاہ اور وزیر محمد خاں کی فوج کا بھاری نقصان ہوا لیکن دونوں اپنی فوج کو لے کر میدان کارزار سے ہٹ گئے۔ (فریڈم اسٹرگل-445)

5 مئی 1858 کو جنگ ککرالہ کے بعد، موضع ستی پور شہر کہنہ بریلی میں نکیا ندی کے کنارے نواب خان بہادر خاں، ناظم روہیل کھنڈ کی فوج کا مقابلہ انگریزی فوج سے ہوا تھا۔ انگریزی فوج کا سربراہ جنرل کیمبل تھا۔ نواب خان بہادر خاں کی فوج میں شہزادہ فیروز شاہ اور وزیر محمد خاں شامل ہوگئے۔ ان کے علاوہ تحریک آزادی کے دیگر رہنما، مالاگڈھ کے نواب ولی داد خاں، ان کے فرزند اسمٰعیل خاں، بالا جی، نواب محمود خاں وغیرہ بھی نواب خاں بہادر خاں کی مدد کے لیے آگئے تھے۔ یہ لڑائی دوپہر سے شام تک جاری رہی۔ اس جنگ میں شہزادہ فیروز شاہ نے ایسی شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا کہ اس کا چرچا ایک مدت تک بریلی میں ہوتا رہا اور بڑے بوڑھے ان کی بہادری کے قصے سناتے رہے۔ سادات نو محلہ بریلی کے ایک معروف بزرگ سید فیروز شاہ کا نام شہزادہ فیروز شاہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ (خان بہادر خاں شہید 188-187)

5 مئی 1858 کو ستی پور اور بریلی کی جنگ کے بعد، طے شدہ پلان کے مطابق، نواب خان بہادر خاں، شہزادہ فیروز شاہ اور دیگر قائدین آزادی بریلی چھوڑ کر براہ چلی بھیت، شاہ جہاں پور میں داخل ہوگئے۔ جنرل جونس بریلی کی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد شاہ جہاں پور پہنچا تھا۔ 8 مئی 1858 کو اس نے مجاہدین پر حملہ کر کے ان کو منتشر کر دیا اور شہر میں آگ لگا دی۔ شہر میں لوٹ مار اور قتل عام کا بازار گرم ہوا۔ اس کے بعد بھی 12 مئی 1858 سے 24 مئی 1858 تک انگریزوں اور مجاہدین کے درمیان جھڑپیں جاری رہیں۔ 24 مئی 1858 کو جنرل کیمبل نے شاہ جہاں، پور پر حملہ کیا اور قبضہ کرلیا۔ مجاہدین محمدی لکھیم پور میں جمع ہوئے۔ مولوی احمد اللہ شاہ نے پلٹ کر شاہ جہاں پور میں راجہ پوایاں کی گڈھی کا محاصرہ کیا۔ ان کے سر پر 50 ہزار روپے کا انعام تھا۔ وہ سازش کا شکار ہو کر شہید ہوگئے۔ یہ واقعہ 15 جون 1858 کا ہے۔ احمد اللہ شاہ کا سر کوتوالی پر لٹکایا گیا اور نعش کو دفن کرنے کے بجائے جلوا دیا گیا۔ (فریڈم اسٹرگل 5/538)۔ انگریزوں نے مجاہدین کو محمدی سے بھی ڈھکیل دیا اور وہ لڑتے ہوئے بالآخر بٹول نیپال میں پناہ گزیں ہوگئے۔ انگریزوں نے نواب خان بہادر خاں کو نیپال میں ہی گرفتار کر کے 24 مارچ 1860 کو بریلی میں پھانسی کی سزا دی تھی۔ ان کی قبر ڈسٹرکٹ جیل بریلی میں ہے۔ شہزادہ فیروز شاہ نیپال نہیں گئے۔ انھوں نے کانپور اور اٹاوہ کی راہ سے راجستھان میں قدم رکھا اور وہاں سے صوبۂ سرحد میں دریائے اٹک کو پار کر کے افغانستان میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد ایران سے گزر کر حجاز پہنچے۔ ان کی وفات حجاز میں ہوئی (قادری-551) اس طرح جنگ آزادی 1857 کا ایک شہزادہ طویل جدوجہد کے بعد سرزمین حجاز میں آسودۂ خواب ہوگیا۔

حواشی:

1. سید اطہر عباس رضوی، فریڈم اسٹرگل ان اترپردیش۔ جلد-5 شعبۂ اطلاعات لکھنؤ-1960
2. ایوب قادری۔ جنگ آزادی 1857۔ معارف پریس لاہور-1976
3. امیر مینائی۔ انتخاب یادگار۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ایڈیشن-1982
4. سید تعظیم علی نقوی۔ بریلوی۔ تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ، جلد-3، مسودے کی عکسی نقل۔
5. سید مصطفیٰ علی۔ بریلوی۔ خان بہادر خاں شہیدؒ۔ ایجوکیشنل پریس کراچی 1966-

□□□

پتہ:
73, Ghoolwalan,
Bareilly - 243003 (U.P.)

لئیق رضوی

مولوی لیاقت علی

1857 کی پہلی جنگ آزادی کا جب بھی ذکر چھڑے گا، مولوی لیاقت علی کا نام بھی لیا جائے گا۔ الٰہ آباد کے اس جیالے مولوی نے نہ صرف لوگوں کو فرنگیوں کے خلاف متحد اور صف آرا کیا بلکہ خود بھی تلوار لے کر میدان میں آ گئے۔ 6 جون کو الٰہ آباد آزاد کرا لیا گیا۔ 17 جون کو کرنل نیل نے یہاں دوبارہ قبضہ کر لیا، لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور قریب 12 برس تک وہ ملک کے مختلف علاقوں میں فرنگیوں سے نبرد آزما رہے۔

لیاقت علی 17 جولائی 1823 کو الٰہ آباد کے پاس مہگاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مہر علی کاشتکار تھے۔ لیاقت علی کو دین و حکمت کی اعلیٰ تعلیم دی گئی۔ ان کے چچا دائم علی کمپنی کی فوج میں صوبے دار تھے۔ بعد میں دائم علی بھتیجے کو بھی فوج میں لے گئے۔ مولوی لیاقت علی فیروز پور رجمنٹ میں گھوڑ سوار پلٹن میں سپاہی رکھے گئے۔ قریب تین برس تک وہ فوج میں رہے، اور پھر سرکار مخالف مزاج کی وجہ سے یا تو انھوں نے نوکری چھوڑ دی یا انھیں فوج سے برطرف کر دیا گیا۔ مولوی لیاقت علی گاؤں لوٹ آئے اور یہاں کی مسجد میں امامت اور بچوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داری سنبھالی۔ مولوی لیاقت علی شروع سے انگریزوں کے مخالف تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی تلقین کرتے تھے۔ وہ علما کے اس گروپ میں بھی شامل تھے، جو اپنے طور پر ملک کی آزادی کے لیے مہم چھیڑے ہوئے تھا۔ انقلاب کے خد و خال ترتیب دینے کے لیے جو خفیہ میٹنگ ہوئی تھی اس میں لیاقت علی بھی شامل تھے۔ انقلاب کی مقررہ تاریخ (31 مئی) کی اطلاع انقلابیوں تک پہنچانے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا ماحول بنانے کے لیے انھوں نے اپنے زیر اثر علاقوں میں متواتر دورے کیے۔ (1)

6 جون کی شب جب الٰہ آباد میں بغاوت بھڑکی تو مجاہدین نے مولوی لیاقت علی کو اپنا امیر تسلیم کیا۔ وہ مہگاؤں سے الٰہ آباد آ گئے اور خسرو باغ کو اپنا مرکز بنایا۔ یہاں دربار لگا جس میں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے نام کا خطبہ اور ایک فرمان پڑھا گیا، جس میں لیاقت علی کو الٰہ آباد کا گورنر نامزد کیا گیا تھا۔ اس موقع پر مغل بادشاہ کو 101 اور لیاقت علی کو 21 توپوں کی سلامی دی گئی۔ (2) اس کے بعد تقریباً پورا الٰہ آباد مولوی لیاقت علی کی سربراہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جیل کا پھاٹک توڑ کر قریب تین ہزار قیدیوں کو آزاد کیا گیا۔ اس مہم میں بہت سے انگریز مارے گئے۔ 30 لاکھ روپے کا سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا۔ پولس بھی انقلابیوں سے مل گئی۔ کلکٹریٹ اور کوتوالی سمیت شہر کی بھی اہم عمارتوں اور دفتروں پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا۔ 7 جون کو شہر میں جشن کا سماں تھا، جمنا پار کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر، پورا الٰہ آباد انقلابیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ مولوی لیاقت علی نے اپنے حوصلے اور جنگی تجربے کی بنا پر انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ قلعے کے سوا بقیہ تمام اہم عمارتوں پر باغیوں کا ہرا جھنڈا لہرانے لگا۔ اس دوران انگریزوں کی مدد کے لیے باہر سے کمک آئی مگر انقلابیوں کی کامیاب مورچہ بندی کی وجہ سے ان کی ایک نہ چل سکی۔ انگریز قلعے میں قید ہو کر رہ گئے۔ قلعے پر قبضے کے لیے مولوی لیاقت علی نے مجاہدوں کے ساتھ قلعے کے مغربی حصے کی پشت سے حملہ کیا۔ زبردست جنگ ہوئی۔ دونوں طرف کے بہت سے سپاہی مارے گئے، لیکن آخر کار جیت انگریزوں کی ہوئی اور مجاہدوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مولوی لیاقت علی کو امید تھی کہ جب مجاہد قلعے پر حملہ کریں گے تو وہاں تعینات فیروز پور رجمنٹ کے سکھ فوجی بھی ان سے آملیں گے، مگر ایسا نہ ہوا۔ (3) شہر کے ساتھ، دوآبہ اور گنگا پار کے علاقوں میں بھی مجاہدین نے انگریزوں کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ مولوی لیاقت علی نے بہادر شاہ ظفر کو خط بھیج کر الٰہ آباد میں مجاہدین کی کامیابی کی اطلاع دی۔ انھوں نے لکھا کہ تمام ہندو اور مسلمان ساتھ ہیں اور اللہ نے چاہا تو الٰہ آباد سے فتح پور تک انگریزوں کو دانہ پانی نصیب نہیں ہوگا۔ برج موہن یادو نے لکھا ہے کہ دارالحکومت کی حفاظت کے لیے انھوں نے ایک ہزار گھوڑ سوار فوجی، پانچ توپیں اور چھ ہزار روپے دہلی بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عباس رضوی کی کتاب ''سوز دلی'' میں 17 جون کو الٰہ آباد سے سو گھڑسواروں کے دلی پہنچنے کا ذکر ہے۔ جذبۂ جہاد کو عام کرنے کے لیے جون 1857 میں انھوں نے دو اعلان ایک نظم اور ایک نثر میں شائع کرا کر تقسیم بھی کرائے۔ پہلے اشتہار میں جو نظم ہے وہ مولوی خرم علی بلہوری کے رسالے ''جہادیہ'' سے لی گئی تھی۔ رسالہ جہادیہ 57 اشعار پر مشتمل تھا۔ مولوی لیاقت علی نے نظم کے شروع کے 27 شعر لیے اور ان میں سے تین اشعار میں انھوں نے ضرورت کے مطابق ترمیم بھی کی۔ (4)

بارہ سو سال کے بعد آئی یہ دولت آگئے
حیف اس دولتِ بیدار سے مومن بھاگے
تھے مسلمان پریشان بغیر از اسباب
شکر سب تو نے دیا اے مرے رب الارباب
یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار
سب دیا تو نے ہمیں اور کیا پھر سردار
بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو

اپنے دوسرے اشتہار میں بھی مولوی لیاقت علی نے انگریزوں کے خلاف شروع کی گئی جنگ کو جہاد قرار دیتے ہوئے لوگوں کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی:

''الٰہ آباد تشریف لائیں اور قلعہ بند کفار نابکار کا قلعہ قمع کر کے بزور تیغ خاک میں ملا دیں اور بقیہ ماندوں کو اس ملک سے بھگا دیں۔'' (5) آزاد حکومت کے قیام کے بعد سب سے بڑا چیلنج بے راہ روی کو ختم کرنا اور قانون و انتظام کی حالت کو درست بنانا تھا۔ مولوی لیاقت علی نے اس مرحلے کو آسانی سے سر کر لیا۔ اپنے ساتھیوں کی مدد سے انھوں نے شہر میں مکمل امن و اماں قائم کیا۔ اپنی کارکردگی اور فیصلوں سے وہ بہادر شاہ ظفر کو برابر مطلع کرتے رہے۔ (6)

الٰہ آباد ایک بڑا محاذ تھا۔ یہاں قلعے میں تقریباً سو برس سے انگریزوں کی چھاؤنی

قائم تھی۔ یہاں گولہ بارود کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اگر یہاں کا قلعہ ہاتھ سے نکل جاتا تو پورے شمالی ہند کی سپلائی منقطع ہوجاتی۔ اس لیے الہ آباد کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے پوری طاقت صرف کردی۔ 9 جون کو کمپنی سرکار نے الہ آباد میں مارشل لا کا اعلان کردیا۔ 11 جون کو کرنل نیل گورے سپاہیوں کا لشکر لے کر بنارس سے الہ آباد پہنچا۔ 12 سے 15 جون تک انگریز فوجیوں نے حملہ کرکے شہر کے کئی علاقوں کو پھر قبضے میں لے لیا۔ 15 جون کو انگریزوں کا حملہ اور تیز ہوگیا۔ 17 جون کو کرنل نیل نے بھاری لاؤلشکر کے ساتھ خسرو باغ اور سرائے خلد آباد کو گھیر لیا۔ دن بھر جنگ ہوئی۔ انقلابیوں نے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ خسرو باغ کی دیواریں خون سے لال ہوگئیں، سینکڑوں مجاہد شہید ہوئے۔ مولوی لیاقت علی نے جب دیکھا کہ انگریزوں کی اس بڑی فوج سے مقابلہ ممکن نہیں ہے تو وہ رات میں کچھ ساتھیوں کے ہمراہ انگریزوں سے لوٹا ہوا خزانہ لے کر کانپور روانہ ہوگئے۔ انگریزوں نے خسرو باغ اور سرائے خلد آباد پر قبضہ کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی الہ آباد پر دوبارہ کمپنی کا اقتدار بحال ہوگیا۔ اس کے بعد انگریز فوجیوں نے مارشل لا کی آڑ میں الہ آباد میں زبردست فساد مچایا۔ بستیاں جلا دی گئیں۔ سینکڑوں لوگوں کو سرعام قتل کیا گیا۔ بزرگوں، عورتوں اور معصوم بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ صرف چوک میں جی ٹی روڈ کے کنارے سات سو لوگوں کو پھانسی دی گئی۔ سرجان، جان کیمبل اور ولیم رسل جیسے کئی انگریزوں نے بھی اس کا بیان کیا ہے۔ کانپور میں مولوی لیاقت علی نے بخشی زین العابدین کے گھر قیام کیا۔(7) نانا صاحب کی فوج میں مولوی لیاقت علی کا اتنا اثر تھا کہ پکڑے گئے ہر انگریز کے مستقبل کا فیصلہ وہی کیا کرتے۔ ایک انگریز خاتون مسز بینٹ کے حوالے سے ڈاکٹر وشوامتر اپادھیائے نے لکھا ہے کہ ان کے حکم کے بغیر کسی انگریز کو چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔(8) 15 جولائی 1857 کو جب جنرل ہیولاک بھاری لشکر کے ساتھ کانپور کی سمت بڑھ رہا تھا تب انقلابیوں نے فتح پور ضلع کے اونگ گاؤں کے قریب مورچہ لے کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ حالانکہ بعد میں انھیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس لڑائی میں بھی مولوی لیاقت علی نے حصہ لیا تھا۔(9) میلسن لکھتا ہے۔ "معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد کا مولوی بھی نانا صاحب کے ساتھیوں میں شامل تھا۔" کرنل ولیمز نے ایک گواہ کے بیانات تحریر کیے ہیں۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ فتح پور کی لڑائی میں مجاہدین آزادی کا کمانڈر کون تھا، اس نے کہا کہ میں نے ٹیکا سنگھ جرنل، الہ آباد کے مولوی اور جوالا پرساد کو کمانداری کے لیے جاتے دیکھا تھا۔ رانی لکشمی بائی کی مدد کے لیے وہ جھانسی بھی گئے۔ ہر جگہ جیت انگریزوں کی ہی ہوئی۔ لیکن لیاقت علی نے ہمت نہیں ہاری۔ انھیں جہاں کہیں بھی مقابلے کی صورت نظر آئی وہ انگریزوں کے خلاف سرگرم جنگ رہے۔ سال بھر بعد وہ پھر الہ آباد کے گنگا پار علاقہ میں آ گئے۔ ہندو پٹیریاٹ نے 22 جولائی 1958 میں لکھا تھا کہ جولائی 1858 میں مولوی لیاقت علی، الہ آباد میں ندی کے کنارے اپنے دوسرے کچھ ساتھیوں کے ساتھ رکے تھے۔ ان کا ہیڈ آفس سوراؤں میں تھا۔(10) مگر کرنل نیل کے لوٹنے اور جلانے جا چکے الہ آباد میں انھیں انگریزوں سے مقابلے کی تاب نظر نہیں آئی۔ بعد میں وہ مولوی احمد اللہ سے جا ملے اور اودھ اور روہیل کھنڈ میں انگریز مخالف سرگرمیوں میں شریک رہے۔ مولوی احمد اللہ کی قیادت میں انقلابیوں نے جب قصیم پور کھیری کے محمدی قصبہ کو آزاد کرالیا تو حکومت کے بندوبست کے لیے جو کونسل بنائی گئی لیاقت علی اس میں بھی شامل تھے۔(11) جب یہاں دوبارہ انگریزوں کی حکومت ہوگئی، تو وہ نیپال چلے گئے لیکن وہاں ٹھہرے نہیں۔ زمانہ، جلاوطنی میں وہ بھیس بدل کر گھوم گھوم کر انگریزوں کے خلاف ماحول بناتے رہے۔ انگریزوں نے انھیں پکڑنے کی تمام کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔ ان کے سر پر 5 ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ جگہ جگہ اشتہار لگائے گئے۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ جلاوطنی کے اسی زمانے میں ٹونک کے کسی مولوی کی بیٹی سے انھوں نے دوسری شادی کی جس سے ایک بیٹی بھی ہوئی۔ بعد میں اپنی بیوی اور بچی کو بڑودہ میں اپنے ایک مرید کے یہاں چھوڑ کر وہ پھر انقلابیوں کو متحد کرنے سفر پر نکل پڑے۔ اس دوران انھوں نے کئی جگہ کا دورہ کیا۔ 1859 میں وہ سورت ضلع کے سیاچین اسٹیٹ چلے گئے اور ایک خفیہ انقلابی مرکز بنا کر مجاہدین کو پھر اکٹھا کرنے لگے۔ یہاں ایک ٹیلے کے نیچے انھوں نے توپوں کا کارخانہ بھی بنا لیا۔(12) سورت میں مولوی لیاقت علی قریب 10 برس تک رہے۔ 1869 میں نواب ابراہیم خاں کی مخبری پر انھیں سچالی اسٹیشن پر گرفتار کرلیا گیا۔ انگریزی فوج مولوی لیاقت علی کو الہ آباد لے آئی۔ یہاں اسٹیشن جج اے آر پولک کی عدالت میں ان پر سرکار کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ ان کے خلاف 266 گواہ پیش کیے گئے۔ مولوی لیاقت علی نے بنا کسی خوف کے عدالت میں قبول کیا کہ انھوں نے مجاہدین کی قیادت کی تھی۔ انگریز جج نے کہا کہ آپ مسلمانوں کے مذہبی رہنما ہیں اگر آپ ان غلطیوں پر شرمندگی ظاہر کریں تو آپ کو معافی مل سکتی ہے، لیکن مولوی لیاقت علی نے معافی مانگنے سے انکار کردیا۔ انھوں نے کہا کہ "اگر میں چوہا بھی ہوتا تو انگریزوں کی نسیں کاٹ کر رکھ دیتا۔"(13) اس مقدمے کا فیصلہ 24 جولائی 1872 کو سنایا گیا۔ عدالت نے انھیں 1857 کے ایکٹ کی دفعہ (1)11 کے تحت مجرم قرار دیا اور تا عمر قید کی سزا سنائی۔ سیلولر جیل بھیجے جانے سے قبل انھیں سخت پہرے میں مہگاؤں لایا گیا۔ انھیں دیکھنے اور ملنے کے لیے مجمع لگ گیا۔ لیاقت علی نے لوگوں کو ہمت نہ ہارنے اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کی۔ پھر انھیں کالا پانی کی سیلولر جیل میں بھیج دیا گیا، جہاں 17 مئی 1892 کو مولوی لیاقت علی کا انتقال ہوگیا۔ انھیں وہیں دفن کیا گیا۔

حواشی:

1. عبدالباری آسی، الجمعیۃ، دہلی 2 ستمبر 1957
2. اجیت کمار، روزنامہ بھارت، الہ آباد 21 جنوری 1956
3. سندرلال، بھارت میں انگریزی راج، حصہ دوم۔ ص 329
4. درخشاں تاجور، ہندوستان کی جدوجہد میں اردو شاعری کا حصہ۔ ص 189
5. غلام رسول مہر، مجاہدین 1857۔ ص 218
6. سندرلال، بھارت میں انگریزی راج، حصہ دوم۔ ص 330
7. غلام رسول مہر مجاہدین 1857۔ ص 219
8. وشوامتر اپادھیائے، سنہ 57 کے بھولے بسرے شہید، حصہ دوم، ص 7
9. خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی 1857، ص 253
10. خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی 1857، ص 344
11. خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی 1857۔ ص 344
12. وشوامتر اپادھیائے، سنہ 57 کے بھولے بسرے شہید۔ ص 8,7

☐☐☐

پتہ:
96/B-3, ARAWLI, SEC. 34, NOIDA (U.P.)

محمد محمود فیض آبادی

ماحولیاتی تحفظ

فطری ماحول کی پاکیزگی، سالمیت اور استقرار کو پچھلی دو صدیوں سے جاری سرمایہ دارانہ صنعتی نظام سے شدید خطرہ لاحق ہے جس کی مطلق غایت دولت کی لامحدود افزائش کے لیے ارضی وسائل کا بے دریغ استحصال ہے۔ اس کے نتیجے میں دنیا کو ماحولی کثافت، بے لگام شہری توسیع آبادی کی کثرت، ہوا اور پانی کی آلودگی، ناقابل تجدید منابع کے اختتام، قدرتی ماحول کی بربادی اور گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج سے زمین کی تمازت جیسے مسئلوں کا سامنا ہے۔ ان پر خطر مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے بیسویں صدی کے وسط تک خود مغرب کے اہل فکر بیدار ہوئے۔ ''گرین'' (سبز) تحریکات، گرین پارٹیوں اور ''گرین پیس'' نے جنم لیا۔ انھی اصلاحی اور احتجاجی تحریکات کے زیر اثر قدرتی ماحول کی حفاظت قومی اور بین الاقوامی سیاست کا اہم ترین مسئلہ بن گئی۔ قومی حکومتوں اور بین الاقوامی برادری نے قدرتی ماحول کو تباہی سے بچانے کے لیے ضروری پالیسیوں اور تدابیر پر توجہ کی اور ان کو بروئے عمل لانے میں سرگرم ہو گئیں۔

عالمی سطح پر ماحولیاتی تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے اقوام متحدہ کی مجلس عام نے 1972 میں ایک قرار داد منظور کر کے اقوام متحدہ کا ماحولی پروگرام [United Nations Environmental Programme - UNEP] وضع کیا جس کا صدر دفتر نیروبی (کینیا) میں کام کرتا ہے۔ اس کا وظیفہ انسانی ماحول کی حفاظت اور بہتری کی غرض سے قومی حکومتوں کو پالیسیاں وضع کرنے اور ان پالیسیوں اور پروگراموں پر عمل درآمد کرانے میں مدد دینا ہے۔ اس ادارے کا اہم ترین محضر ہے۔ جب ترقی یافتہ ملکوں کے کارخانوں سے کیمیاوی ماڈوں خصوصاً کلورو فلورو کاربن [CFC] کے بکثرت اخراج سے کرۂ ارض کے اوپر اوزون [Ozone] کی پرت چھننے لگی اور اس میں شگاف نمودار ہوئے تو ان ملکوں نے اس خطرے کا احساس کر کے اوزون پرت کی حفاظت کے وائنا میثاق پر دستخط کیے۔ اس میثاق پر عمل درآمد کی غرض سے ان ملکوں نے 1987 میں عہد نامۂ مانٹریال [Montreal Protocol] پر دستخط کیے۔ اس کے تحت ان ملکوں نے خود کو پابند کیا کہ وہ یکم جنوری 2005 کو ڈیڈ لائن مان کر اوزون کو فنا کرنے والے تمام ماڈوں کی تولید بند کر دیں گے۔ لیکن مارچ 2004 میں مانٹریال میں منعقد ان ملکوں کی کانفرنس میں 11 صنعتی ملکوں کو مہلت دی گئی کہ وہ 2005 کے بعد بھی اس عہد نامے کے تحت عائد اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ (اوزون وہ نیلگوں گیس ہے جو زمین کے بالائی حصے کو محیط ہے اور جو سورج سے نکلنے والی فرا بنفشی شعاعوں [Ultraviolet Rays] کو جذب کر کے انسانوں کو ان کے مضر اثرات مثلاً جلد کے سرطان اور موتیا بند سے محفوظ رکھتی ہے۔

ماحولیات کی تاریخ میں اہم ترین واقعہ ریو دی جنیرو (برازیل) میں 3 سے 14 جون 1992 تک اقوام متحدہ کی کانفرنس بابت ماحول و ترقیات [Unconference on Environment and Development - UNEP] کا انعقاد تھا۔ جو چوٹی کانفرنس Earth Summit کے نام سے معروف ہوئی۔ اس کا اختتام درج ذیل دستاویزوں کی تفویض پر ہوا:

1. ماحول اور ترقیات سے متعلق اعلانیہ
[Declaraton on Environment and Developments]

2. جنگلات کی نگہداشت سے متعلق عالمی اتفاق رائے کے حصول کے لیے اصولوں کا بیانیہ
[Statement of Principles for Global Consensus on Management, Conservation and Sustained development of Forests]

3. استقراری توسیع سے متعلق ایجنڈا 21
[Agenda 21 on Sustained Development]

4. حیاتیاتی تنوع سے متعلق میثاق
[Convertion on Biological Diversity]، اور

5. فضائی تغیر سے متعلق میثاق
[Unframework Convention on Climate Change]

آخر الذکر میثاق 1994 سے نافذ ہوا۔ اسی میثاق پر عملدرآمد کے لیے دسمبر 1997 میں 38 صنعتی ملکوں نے عہد نامۂ کیوٹو [Kyoto Protocol] پر دستخط کیے جس کی غایت کرۂ ارض کی تمازت کا سدِ باب کرنا ہے۔

بیسویں صدی کے اواخر کا ایک اہم سیاسی مسئلہ بے لگام صنعت کاری کے نتیجے میں گرین ہاؤس گیسوں خصوصاً کاربن ڈائی آکسائڈ کے اخراج سے فضا کے تغیر اور کرۂ ارض کی تمازت کا تھا۔ اس پر قابو پانے کے لیے 1992 میں اقوام متحدہ کی ماحولیاتی کانفرنس نے ایک میثاق وضع کیا تھا۔ اس میثاق پر عمل درآمد کی غرض سے دسمبر 1997 میں کیوٹو (جاپان) میں 38 صنعتی ملکوں کے اجتماع میں عہد نامۂ کیوٹو (Kyoto Protocol) پر دستخط کیے گئے جس کی رو سے 35 ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کو پابند کیا گیا کہ وہ 1990 کی سطح سے 2012 تک گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں 5.2 فیصد کی تخفیف کریں۔ 2004 میں مطلوبہ توثیق کے بعد یہ پروٹوکول 16 فروری 2005 سے نافذ ہو گیا۔ لیکن اس عہد نامے کے کامل نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اس پر دستخط کرنے کے بعد 2001 میں اس بنا پر اس سے علیحدہ ہو گیا کہ اسے دنیا کی فضا کی بہتری کے لیے اپنے مزدوروں کے مفاد کی قربانی منظور نہیں ہے۔ اس کے بعد سے وہ اس سلسلے میں مذاکرات میں حصہ لینے یا کسی پابندی کو قبول کرنے سے انکار کرتا رہا ہے۔ اس ملک کی آبادی دنیا کی مجموعی آبادی کی صرف چار فی صد ہے لیکن صنعتی سپر پاور ہونے کے ناتے وہ دنیا کی مجموعی کاربن ڈائی آکسائڈ کی تقریباً 24 فی صد مقدار خارج کرتا ہے۔ دوسرا صنعتی ملک جس نے ابھی تک اس عہد نامے پر دستخط نہیں کیے آسٹریلیا ہے۔

□□□

Depatt. of Political Science
Aligarh Muslim University, Aligarh-202002

بابر شریف

ستیش گجرال

کسی بھی عظیم شخصیت یا فنکار کی زندگی ایک عام آدمی کے لیے کشش کا باعث ہوتی ہے۔ اس کا بچپن، جوانی اور زندگی کے مختلف گوشوں سے واقفیت، اس کی سماجی اور معاشی حیثیت اور یہ جاننے کی للک کہ اس نے اپنے فن کی تخلیق کن حالات میں شروع کی مزید برآں اس کے تخلیق کردہ مواد کا موضوع عام زندگی سے کتنا قریب ہے؟ یہ تجسس اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظیم فنکار (ستیش گجرال) جس نے مصوری کے تئیں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ بچپن میں ہی ایک حادثے کی وجہ سے اس کی قوتِ گویائی ختم ہو گئی تھی۔ بعد ازاں وہ فنکار Abnormal زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اپنے چاہنے والوں کے لیے کئی طرح کے سوالات چھوڑ جاتا ہے۔ عام طور پر وہ لوگ جو کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں یا جو پیدائشی معذور ہوتے ہیں ایک طرح کے احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہ انھیں حالات میں اپنی ساری زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یہی احساس انھیں روزانہ کے معمولی کام کرنے سے بھی روکتا ہے اور وہ دوسروں پر منحصر ہو جاتے ہیں۔ ایک انگریز فلاسفر نے کہا ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی عظیم ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ عظمت حاصل کر لیتے ہیں اور کچھ لوگوں پر جان بوجھ کر عظمت تھوپ دی جاتی ہے۔ مگر جہاں تک ستیش گجرال کا تعلق ہے انھوں نے اپنی محنت اور تخلیق کی بنیاد پر عظمت حاصل کی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا احساس و جذبہ تھا جس نے ایک معذور شخص کو تخلیق کار بننے کے لیے مجبور کر دیا۔ اور فنونِ لطیفہ کے تینوں ہی بڑے شعبے یعنی فن مصوری، سنگ تراشی اور عمارت سازی کو اپنے درد کا درماں جانا۔ یہ تینوں ہی شعبے تکنیکی ہیں۔ جس میں اپنی feeling کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں کی بھی کٹھن محنت و مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک معذور شخص نے بڑے بڑے کینواس رنگ ڈالے، پتھروں کو تراش کر دلکش form کی تخلیق کی۔ زمین کے سینے پر عظیم عمارتیں کھڑی کر دیں، بلجیم ایمبیسی اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

وہ ایک ایسا عظیم فنکار ہے جس نے آج تک اپنے گونگے پن پر آنسو نہیں بہائے۔ جو کبھی اپنے دکھ پر نہیں رویا بلکہ دنیا کے غم کو اپنا غم بنا لیا، جس نے ملک کی تقسیم دیکھی، اس کے کرب کو محسوس کیا اور تباہ و بربادی کے دردناک موضوعات کو اپنی پینٹنگ کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا۔ ایک عرصے تک وہ اسی تقسیم کے موضوع کو رنگتا رہا یہاں تک کہ اس نے اپنے دل کا سارا زہر کینواس پر انڈیل ڈالا۔ اس طرح اس نے انسانیت کے تئیں اپنی وفاداری کا ثبوت دیا اور درندگی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اور اپنے انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ ایک ایسا انسان جس کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ذات اور نہ ہی وہ کسی ملک کی سرحدوں میں گھرا ہوا ہے۔ جو Universal ہے اپنی تخلیق کی طرح، اپنے احساس کی طرح اور اپنے فکر کی طرح۔ پنجابی زبان کی مشہور ادیبہ امرتا پریتم نے ایک بار لکھا تھا "میں نے اپنے مکان کا نمبر ہٹا دیا ہے، گلی اور سڑک کے نشان مٹا دیے ہیں، شہر اور ملک کا نام ختم کر دیا ہے۔ جب تمھیں زندگی کہیں کھلی فضا میں سانس لیتی ہوئی ملے تو تم سمجھ لینا وہی میرا دیش ہے۔ وہی میرا شہر ہے اور وہی میرا گھر ہے۔" شاید کہیں نہ کہیں ستیش گجرال کو چھو کر یہ لفظ ضرور گزرے ہوں گے تبھی تو ان کی کلاکرتیوں کو دیکھ کر یہی جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ زندگی آزاد فضا میں سانس لے رہی ہے۔

ستیش گجرال کا جنم مغربی پنجاب کے ضلع جہلم میں 1925 کو کرسمس کے روز ہوا۔ ان کا بچپن ان کے لیے کئی طرح کی پریشانیاں بھی ساتھ لایا جب کہ یہ دور کسی بھی بچے کے لیے بے فکری کا ہوتا ہے وہ محض آٹھ سال کے ہی تھے کہ کشمیر میں ایک حادثے کا شکار ہو گئے جس کی وجہ سے ان کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ اس حادثے سے ان کا ایک پاؤں بھی متاثر ہوا۔ وہ ایک لمبے عرصے تک اس موذی بیماری میں مبتلا رہے جس نے ان کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ اس کے بعد لگاتار ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی حادثہ جڑا رہا۔ ابھی وہ دس سال کے ہی رہے ہوں گے کہ ان کے کان پر Infection ہو گیا اور ان کی سننے کی طاقت بھی جاتی رہی۔ اس بیماری کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح سے پڑھ بھی نہیں پاتے تھے۔ تو انھیں بستر پر دراز ہو کر مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ ان کی اس بیماری کو دیکھتے ہوئے ان کے والد شری اوتار نارائن نے اپنے بیٹے کی تعلیم کا ایسا بندوبست کیا کہ وہ صرف لیٹ کر ہی پڑھ سکے۔ جس کے لیے انھیں اپنے ابتدائی تعلیمی دور میں اردو زبان و ادب کی تعلیم دی گئی۔ اس زمانے میں انھوں نے ایسی کتابیں بھی پڑھ ڈالی جو عام بچوں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ انھوں نے اردو میں سب سے پہلے عظیم شخصیتوں کی آپ بیتی کا مطالعہ کیا جن میں 'گیری بالڈی'، 'نپولین بونا پارٹ'، منشی پریم چند اور ان کے ادب کے علاوہ مرزا اسد اللہ خاں غالب جو کہ اردو کے سب سے مشکل پسند شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ستیش گجرال اپنے والد کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ لالہ لاجپت رائے سے پرستش کی حد تک عقیدت رکھتے تھے، کیونکہ وہ مجاہدہ کرنا جانتے تھے۔

میو اسکول آف آرٹس لاہور میں گجرال کے داخلے کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ انھیں بچپن سے ہی تصویریں بنانے اور پنسل سے لکیریں کھینچنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کے والد شری اوتار نارائن نے بیٹے کے شوق کو دیکھتے ہوئے انھیں میو اسکول لے گئے مگر وہاں انھیں مایوسی ہاتھ لگی کیونکہ یہ کالج Normal طلبہ کے لیے تھا۔ اور ستیش بچپن میں ہی معذور ہو گئے تھے پھر ان کے والد نے بڑی مشکلوں سے اپنے دوست اور پنجاب کے وزیر اعظم سکندر حیات سے میو اسکول آف آرٹس کے ڈینکے نام سفارش کروائی۔ اس طرح گجرال کا داخلہ آرٹس کالج میں ہو گیا اور انھوں نے Applied Art میں اپنی دلچسپی دکھائی۔ اس طرح Commercial Point of View سے آرٹ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ دیگر طلبہ اور کالج کے

اساتذہ کے لیے طنز کا ہدف بنے رہے مگر کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے اور بڑے صبر کا مظاہرہ کیا۔ میو اسکول آف آرٹس کے اسٹوڈینٹ اور معلمین انھیں نام سے نہ بلاتے ہوئے Deafy boy پکارتے تھے۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ یہی لڑکا آگے چل کر فنون لطیفہ میں اسی کالج کا نام روشن کرے گا جہاں اس کا مذاق بنایا جاتا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد بھی گجرال پاکستان میں ہی رہے وہیں رہتے ہوئے انھوں نے بٹوارے کے دکھ اور تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل کو اپنے کینواس پر اتارا۔ تقسیم ہند کے موضوعات پر بنائی گئی گجرال کی پینٹنگ سیریز کی اہمیت و افادیت اس موضوع پر ایک تاریخی حوالے سے کم نہیں ہے۔ ستیش گجرال ایک ایسے مصور ہیں جنھوں نے تقسیم کے دکھ، اس کی مسماری اور اس کے باعث دو فرقوں کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کو اپنی پینٹنگ کا موضوع بنایا۔ ستیش گجرال دوسرے فنکاروں اور مصوروں کی بہ نسبت زیادہ حساس اور Sentimental واقع ہوئے ہیں۔ تقسیم جیسے اہم اور سنجیدہ موضوع کو ستیش گجرال کے علاوہ کسی اور مصور نے رنگنے کے بارے میں سوچا تک نہیں؟ بچپن سے گونگے ستیش گجرال کسی ایک Medium سے بندھ کر نہیں رہے بلکہ ان میں ہر Medium کو برتنے کا حوصلہ رہا۔ وقت ضرورت انھوں نے مختلف رسم الخطوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ستیش گجرال جتنے بڑے مصور ہیں اتنے ہی بڑے سنگ تراش اور Architect بھی۔ سنگ تراشی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اب یہ طے کرنا Art critict کا کام ہے کہ وہ زیادہ اچھے Painter ہیں یا Sculptor یا پھر اس سوال کا جواب ستیش گجرال ہی دے سکتے ہیں۔ مگر یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک عظیم انسان ہیں۔

ستیش گجرال نے سیسا اور گرینائٹ میں ڈھیروں شلپ گڑھے ہیں جنھیں ساری دنیا میں سراہا گیا ہے۔ ایک بڑے مصور کی حیثیت سے بھارت کے ان گنے چنے فنکاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے جنھوں نے غیر ممالک میں بھارتی فنکاروں کے وفد کی نمائندگی کی ہے۔ اور وہاں بھی نقاد ان فن کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ ان کی ایک پینٹنگ ''شطرنج کے کھلاڑی'' نے ان کی شہرت کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس پینٹنگ کے ذریعے انھوں نے زمانہ ماضی میں بھارت میں بادشاہوں کا اپنی رعیت کے ساتھ کیسا سلوک تھا۔ شاہزادے عوام کے دکھ درد کو بھول کر محض اپنے آرام کی فکر کیا کرتے تھے اور سیر و تفریح میں مست رہتے تھے۔ دوسرے فنکاروں کی طرح ستیش گجرال Glamour میں نہیں رہے اور نہ ہی انھوں نے اپنی پہچان بنانے کے لیے Shortcut کا راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے محنت سے کبھی جان نہیں چھڑائی۔ اسّی سال کا جیون گزار لینے کے بعد کسی بھی شخص میں ٹھہراؤ آ جانا ایک فطری بات ہے۔ مگر ایک فنکار جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے اس کے فن میں اتنی ہی تازگی آ جاتی ہے، ستیش گجرال کی شیلی میں یہی تازگی آج بھی صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ ستیش گجرال ایک معروف آرکٹکٹ بھی ہیں، نئی دہلی میں بنی بیلجیم ایمبیسی کی عمارت کو بیسویں صدی کی عظیم عمارت ہونے کا خطاب انٹرنیشنل فورم آف آرکٹکٹ کی جانب سے دیا گیا ہے، حکومت ہند نے بھی انھیں پدم بھوشن جیسے بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔

ستیش گجرال Maxico کے مصور اروزکو اور سیلوروز سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اور انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ عوام میں ان کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ ان کی تخلیق میں عام شہریوں کے جذبات و مسائل کو ایک خاص انداز میں پیش کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ستیش گجرال پر ایک ''عوامی فنکار'' ہونے کا لیبل بھی لگا۔ ہم اگر ان کی پینٹنگ میں form کا مشاہدہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان کے form بہت solid ہوتے ہیں وہ برش اور رنگوں کو بڑے ہی احتیاط سے Handle کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی پینٹنگ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ ان کی تصویروں میں لکیریں زیادہ باریک اور مہین نہیں ہوتی مگر پھر بھی ان میں ایک خاص رنگ و آہنگ پایا جاتا ہے۔ "Dancing Ganesh" کی سیریز اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ان کی تخلیقات میں روایات کی سوندھی خوشبو کو محسوس کیا جا سکتا ہے ستیش گجرال نے جتنا دھیان پینٹنگ کی Technique پر دیا ہے۔ اتنا اس کی زبان پر نہیں دیا۔ یہ تو رہی نقادوں کی رائے۔ مگر یہاں یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ خود ستیش گجرال فن کے تعلق سے کیا کہتے ہیں۔ ان کے مطابق کوئی بھی فن فکر کی دعوت نہیں دیتا بلکہ وہ تو فنکار کے جذبات اور احساسات سے پیدا ہوتا ہے اسی لیے فن کا تعلق علم سے نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس طرح دیکھا جائے تو ستیش گجرال نے مشہور Art critict تھامس مان کی اس بات کو رد کر دیا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ''میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ مستقبل میں وہ سارا فن ملامت کی نظروں سے دیکھا جائے گا جس میں کسی فکر یا ذہن کا دخل نہیں ہوگا جیسے کالا جادو۔''

تھامس مان پلاسٹک آرٹ کے ٹوٹکے کو کالا جادو کہتے ہیں کیونکہ ان کے مطابق یہ صرف form یا ہیت کو لے کر فکر مند ہے اور ستیش گجرال کی تخلیق کو دیکھ کر صاف پہچانا جا سکتا ہے کہ وہ پینٹنگ میں ہیئت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور دیکھنے والوں کو صرف Technicalview سے ہی دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور نقاد ان فن یہ مانتے ہیں کہ جو آرٹسٹ آرٹ کو کسی علم کے مطابق نہیں ڈھال سکتا وہ لوگوں کو صرف تکنیکی نظریے سے ہی دیکھنے کے لیے اکساتا ہے۔ حسن اپنے آپ میں ایک طاقت ہے۔ اسے کسی بھی form کے ذریعے technical طریقے سے Handle نہیں کیا جا سکتا۔ تقسیم ہند جیسے حساس موضوع کو رنگنے والا منفرد مصور محض ہیئت کی ہی بات نہیں کرتا بلکہ اس کے پیچھے اس کے احساس اور جذبات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ وہ مصور جو بٹوارے جیسے سنجیدہ موضوع کو بھی برتنا جانتا ہو، محض ہیئت کے پیچھے نہیں بھاگ سکتا۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ستیش گجرال form کی مضبوطی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی ہیئت آزاد نہیں ہو سکتی جب کہ ہر form کسی نہ کسی جذبات کی عکاس ہوتی ہے۔ کوئی بھی medium کبھی بھی ستیش گجرال کے لیے کسی بھی طرح کی مشکل کھڑی نہیں کر سکا Burn wood ہو یا Iron وہ کسی بھی میڈیم میں اپنی کلاکرتی کی تخلیق کرتے وقت اس میں اتنا رم جاتے ہیں کہ انھیں میڈیم کی کھردرتا کا احساس ہی نہیں ہو پاتا، وہ مشکل ماحول میں بھی اپنے آپ کو ڈھال لینا جانتے ہیں۔ ایسے ہی فنکار کا نام ستیش گجرال ہے۔ □□□

پتہ:
Ghazal Art Gallery, Qidwai Road, Mominpura,
Nagpur - 440018(Maharashtra)

حسن مثنیٰ

ریڈیو نشریات اور اردو

آج ہم سبھی Information Explosion اور Infotainment کے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن، موبائل اور انٹرنیٹ نے اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے اور یہ ذرائع ترسیل آج بھی نت نئے انداز میں اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔ ان ذرائع ترسیل و ابلاغ کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر لمحہ بدلتی زندگی کو مزید بہتر بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ابتداءً ایسا محسوس کیا جانے لگا تھا کہ کسی خاص ایجاد سے دوسری ایجاد پر منفی اثرات مرتب ہوں گے یا ان کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ مثلاً ایک دور ایسا آیا جب یہ خیال کیا جانے لگا کہ ٹیلی ویژن کی ایجاد سے ریڈیو کی اہمیت میں کمی واقع ہو جائے گی یا پھر موبائل کے آنے سے ٹیلی فون اپنی اہمیت سے محروم ہو جائے گا یا پھر دنیا اگر انٹرنیٹ اور ورلڈ وائڈ ویب (www) کے حصار میں آگئی تو دیگر ذرائع ترسیل و ابلاغ کم اہم ہو جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ان سبھی نے ہماری ترقی و خوشحالی کو استحکام بخشنے میں مدد کی۔ ریڈیو کی ایجاد کے برسوں بعد ہندوستان میں شوقیہ براڈ کاسٹنگ کا آغاز ہوا پھر 1935 میں ممبئی سے انگریزی اور ہندوستانی دونوں زبانوں میں خبریں نشر کی جانے لگیں۔ یہاں ہندوستانی میں نے اس لیے کہا کہ یہ زبان ایسی زبان تھی جس پر نہ تو پوری طرح ہندی کا ٹھپہ لگایا جا سکتا تھا اور نہ اسے پوری طرح اردو ہی کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس وقت جو بھی پروگرام نشر ہوتے ان کی زبان اردو سے ہی قریب تر تھی اور ان کے لکھنے اور پیش کرنے والے اردو داں ہی تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ دور بخاری برادرز کا دور تھا جو ادب کے لوگ تھے۔ بہرحال اس دور میں نشر ہونے والے پروگراموں کی زبان کو ہم ایک مخلوط زبان کہہ لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ذوالفقار علی بخاری اور ان کے ہمنواؤں کی یہ کوشش تھی کہ ریڈیو نشریات کے لیے ایسی زبان استعمال کی جائے جو عام فہم ہو اور ریڈیو کو عوام سے قریب کرنے میں معاون ہو۔ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس طرح ریڈیو میں استعمال کی جانے والی زبان نے ایک بے تکلف فضا قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی جس میں اردو کا وقیع حصہ ہے۔ یہاں ہم روجر مین ویل کا ایک قول نقل کریں گے جو ریڈیو نشریات اور ان کے انداز تحریر نیز اسلوب پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالتا ہے:

''اس نے (ریڈیو نے) عوامی گفتگو کے ایک بے تکلف انداز اور ایک بے تکلف مباحثہ کو جنم دیا ہے۔ ان دونوں سے بڑھ کر ایک ایسا انداز تحریر تخلیق کیا جو ادب میں اضافہ ہے۔...... ریڈیو نے ایک نیا اسلوب ایجاد کیا ہے۔''

(Roger Manvell-On the Air P-151)

ریڈیو کا نشریاتی نظام ایک ہمہ جہت نشریاتی نظام ہے جو امیر و غریب، اعلیٰ و ادنیٰ، عالم و جاہل، خواندہ و نیم خواندہ افراد سبھی کے لیے یکساں طور پر کشش رکھتا ہے۔ یہ سرحدوں کا پابند نہیں۔ نہ ہی اسے مذہب و ملک اور قوم و قبیلے سے کوئی غرض ہے۔ اسے تو اپنی بات عام انسانوں تک پہنچانا ہے۔ ریڈیو نشریات سماج کا ایسا وسیلہ ہے جس نے سماجی ترقی لانے میں حتی الامکان مدد کی ہے۔ اب اسے ہم اپنے عہد کی ضرورت بھی قرار دینے لگے ہیں۔ یہ ایک موثر، اور کم لاگت والا عوامی ذریعۂ ترسیل ہے جس سے ہماری معلومات میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اب تو ہم اسے آلۂ اظہار رائے کے طور پر بھی استعمال کرنے لگے ہیں، کمیونٹی ریڈیو اس کی واضح مثال ہے۔ اگر اس کے ذریعے نشر ہونے والے پروگراموں کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ اس میں صحت، تعلیم، ماحولیات، زراعت، سماجی ترقی، فلاح و بہبود، تفریح، ادب و سیاست اور صحافت جیسے متنوع مضامین پر مبنی مختلف قسم کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں اور یہی انداز پیش کش اور رنگارنگی و ہمہ جہتی ریڈیو کو دیگر ذرائع ترسیل و ابلاغ سے ممتاز کرتی ہے۔

ریڈیو نشریات اردو کی ترویج میں بھی معاون رہی ہیں۔ اس کی واضح مثال ریڈیو کے ذریعے پیش کیے جانے والے مختلف پروگرام تھے جو اردو زبان میں ہی تحریر کیے جاتے تھے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ان کے پیش کرنے والے عموماً اردو داں ہی ہوا کرتے تھے۔ اس زبان کی قوت نمو اور اس کی جمالیاتی اقدار کچھ اس قدر مستحکم ہیں کہ یہ زبان نامساعد حالات میں بھی مائل بہ ارتقا رہی ہے۔ ریڈیو کے ذریعے پیش کیا جانے والا اردو کے شعرا کا کلام آج بھی ذوق و شوق سے سنا جاتا ہے۔ ان شعرا کے کلام سے ریڈیو نشریات کو فروغ ملا اور اردو زبان کو بھی۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ آج اکثر غیر اردو داں بھی اردو کے نرم و سبک الفاظ کو شیریں گفتار کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اگر ریڈیو نشریات کے ایک اہم جز ریڈیو، ڈراموں اور افسانوں پر مبنی پروگراموں کی بات کریں تو بھی یہ بات واضح طور پر نظر آئے گی کہ ریڈیو نشریات کے آغاز سے ہی آغا حشر کاشمیری، امتیاز علی تاج یا پھر ان کے بعد کی نسل کے ڈراما نگاروں نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عہد

حاضر میں ایف. ایم. ریڈیو (آغاز 1977 مدراس سے) نے ہمارے نشریاتی نظام میں تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح داخل ہوکر ریڈیو کی مقبولیت اور بڑھا دی۔ سامعین کی ایک نئی پود نے جنم لیا ہے جو میڈیا کے دیگر ذرائع سے زیادہ ریڈیو کی طرف راغب ہو رہی ہے اس کا اندازہ ایف. ایم. ریڈیو کی مقبولیت سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب اس کے سننے والے کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سارے پروگرام جو ریڈیو پر نشر کیے جاتے ہیں ان میں اردو کا کیا حصہ ہے اور ان سے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں کس قدر مدد ملی ہے۔ یا اس حوالے سے اس زبان کا دائرہ کتنا پھیلا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اردو نے ایک ایسے میڈیم کی شکل اختیار کرلی ہے جس کے ذریعے ریڈیو نشریات نے ایک خبر یا خیال کو عام لوگوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو زبان ہماری مشترکہ ثقافت کی ترجمان رہی ہے اور اس میں کئی زبان کی شیرینی سمٹ آئی ہے خواہ وہ ذوالفقار علی بخاری کا دور رہا ہو یا اس کے بعد کا زمانہ، ہر عہد میں اس زبان نے ریڈیو نشریات کو سہارا دیا ہے۔ کبھی ڈراما، فلم یا موسیقی کے قالب میں یہ سامنے آئی تو کبھی شاعری اور ادب کی شکل میں، انداز چاہے بدلتے رہے ہوں اردو زبان نے ہر سطح پر ہماری تہذیبی ادبی ثقافتی زندگی کو مالا مال کیا ہے۔ ٹیلی ویژن آج کا نہایت چابک دست اور جدید تکنیک سے آراستہ میڈیا ہے اس میں بھی جب لفظوں اور آوازوں یعنی Audio کی بات کی جاتی ہے تو ریڈیو کا پرانا نسخہ اپنایا جاتا ہے یعنی سادگی اور روانی سے بھرپور زبان کا استعمال ایسی سادہ، رواں اور صاف زبان جو بآسانی ناظرین کی سمجھ میں آجائے۔ ایسے میں اردو زبان ہی انھیں سہارا دیتی ہے۔ اسے ایک مثال سے یوں سمجھیے کہ تقریباً پچاس برسوں سے ہم سماچار، کا لفظ سنتے چلے آرہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے تمام ہندی خبر ناموں میں سماچار کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن عام ہندوستانی ''خبر'' سننے اور دیکھنے پر مصر ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ خود کو اس لفظ سے قریب تر محسوس کرتا ہے۔ آپ کوئی بھی پرائیویٹ نیوز چینل نیوز دیکھیے آپ کو خبریں، خبر، خاص خبر جیسے الفاظ سننے کو مل جائیں گے جو کہ اردو کے عام مستعمل الفاظ ہیں۔ اسی طرح آپ کی عدالت، حقیقت، تفتیش، سنسنی، دربار عام، روبرو وغیرہ الفاظ کا میڈیا میں استعمال کیا اردو زبان کی مقبولیت کی گواہی نہیں دیتا؟ میں نے کہیں لتا منگیشکر کا انٹرویو پڑھا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ انھوں نے موسیقی میں کمال حاصل کرنے کے لیے اردو زبان سیکھی تھی اور یہ بات آج بھی صد فیصد درست ہے کہ جو اداکار یا موسیقار اردو سے نابلد ہیں وہ مکالمے یا گیتوں کے الفاظ ادا کرتے ہوئے اکثر ناظرین کو بدحظ کردیتے ہیں۔ پوری میڈیا انڈسٹری میں 75-70 فیصد الفاظ اردو ہی کے استعمال ہوتے ہیں جن کی عمدہ ادائیگی کے بغیر نہ آپ متن سے انصاف کرسکتے ہیں نہ خوش گوار تاثر پیدا کرسکتے ہیں۔ ہماری نوجوان نسل جو اردو زبان و ادب سے دور ہوتی جارہی تھی یا اس زبان اور تہذیب سے دوری اختیار کرنے لگی تھی اب اس زبان و تہذیب سے قریب ہونے کے لیے کوشاں ہے۔ اگر اردو پروگراموں پر مبنی ریڈیو نشریوں اور ایف. ایم. چینلوں کے نشریوں کو بغور سنا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ ان کے ذریعے اردو زبان کی ترویج و اشاعت بہ خوبی ہو رہی ہے۔ دہلی سے ایف. ایم. گولڈ 106.4MHZ پر ''انداز بیاں'' جیسے پروگرام ہوتے ہیں جو غزلوں پر مبنی ہوا کرتے ہیں۔ اس طرح F.M. Rainbow پر آداب، آداب عرض اور شعر و نغمہ جیسے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ حال ہی میں ریڈیو کے ایک انٹرنیشنل چینل World Space نے 135 ممالک میں اپنی نشریات شروع کی ہیں جس پر بزم خانم، ایک فنکار، ادائے خاص، فلمی سوغات، سنو کہانی، تاریخ کے جھروکے سے، غزل اس نے چھیڑی جیسے پروگرام نشر کیے جارہے ہیں جو اس بات کی شہادت ہیں کہ اردو زبان کو بیرونی ممالک میں بھی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے جس میں ریڈیو نشریات کا نہایت اہم حصہ ہے۔ ریڈیو نشریات نے آہستہ آہستہ سامعین کا ایک حلقہ تیار کردیا ہے جو اردو کے شیریں اور نرم الفاظ کو نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ انھیں اپنی گفتگو میں استعمال کرنے کا خواہاں بھی نظر آتا ہے۔ اسے اب تلاطم، فضا، خوش آمدید، گم شدہ، تلاش، خواہش وغیرہ الفاظ کے استعمال کرنے میں لوگوں کو لطف آنے لگا ہے اور وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اس قسم کے الفاظ استعمال کرکے وہ اپنی زبان کو شگفتہ بنا سکتے ہیں۔ آج ریڈیو کے تقریباً سبھی چینلز پر ان افراد کو اہمیت دی جاتی ہے، عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جو اردو کے الفاظ کو خوبی سے برتتے ہیں اور ان کی خوب صورتی کو قائم رکھتے ہیں۔ کئی F.M. چینلز پر ان افراد کو ہی پرزینٹر (Presenter) بنایا جاتا ہے جن کی زبان درست ہو۔ کہنا یہ ہے کہ موجودہ دور میں اردو سے وہ افراد بھی قدرے مانوس ہوتے جارہے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ ایک سروے کے مطابق اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ ذرائع ابلاغ کے وہ گوشے قارئین، سامعین یا ناظرین زیادہ دلچسپی سے پڑھنا سننا یا دیکھنا پسند کرتے ہیں جن کا تعلق اردو زبان و ادب سے ہوتا ہے یا پھر ان میں اس زبان کی چاشنی ملی ہوتی ہے۔ ایک حالیہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ غیر سرکاری اداروں میں ان افراد کو اہمیت دی جانے لگی ہے جو انگریزی اور ہندی کے علاوہ اردو بھی جانتے ہوں۔

□□□

پتہ:
102, Kaveri Hostel, JNU,
New Delhi-110067

مناظر عاشق ہرگانوی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے ایک مختصر گفتگو

پروفیسر جگن ناتھ آزاد شاعر تھے، ماہر اقبالیات تھے، تنقید نگار اور خلکہ نگار بھی تھے اور مقرر بھی۔ اعتماد اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے۔ اپنی ہر نئی کتاب مجھے بھیجتے تھے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے خواھش ظاہر کی تھی کہ ان پر ایک کتاب لکھوں، جسے وہ اہتمام سے شائع کرائیں گے۔ میں نے وعدہ بھی کرلیا تھا۔ جو میں پورا نہ کرسکا۔ لیکن جگن ناتھ آزاد نے اس کا برا نہیں مانا۔

ایک ملاقات کے دوران میں نے ان سے مختصر سا انٹرویو لیا تھا۔ میرا پہلا سوال تھا:

■ آپ کے ادبی سفر کا آغاز کب ہوا؟

جواب: جب میری عمر سات آٹھ برس کی تھی۔ یعنی 1927 میں۔

■ اردو کے پرانے لکھنے والوں کی حد کہاں تک ہے؟ اور نئے لکھنے والوں کی خصوصیات کیا ہیں؟

جواب: میں ادب میں پرانے اور نئے کی تقسیم کا قائل نہیں ہوں۔ اقبال کا ایک شعر سنیے۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

جہاں تک میری بات ہے، میں میر تقی میر کو جدید اور ان کے مقابلے میں داغ اور حسرت موہانی کو قدیم مانتا ہوں۔

■ مختلف ادوار کے ادب میں قدر مشترک کا پایا جانا اپنی جگہ صحیح تو ہے لیکن کیا ہر دور کے ادب کی الگ الگ خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں؟

جواب: جی ہاں، ہوتی ہیں۔ تلاش، جگر کاوی، جذبے کی سرشاری اور وقت کا تلاطم، زبان و بیان کا طلسم سبھی چیزیں مل کر ادب کی خصوصیتیں بنتی ہیں اور ہر دور میں الگ الگ تشخص کی نشاندہی کرتی ہیں۔

■ کیا ہمارے معاشرے میں جدید اردو نظم کے مزاج کو اپنانے کی صلاحیت ہے اور کیا قاری کا ذہن اس کی موجودہ ہیئت کو قبول کرسکتا ہے؟

جواب: جی ہاں۔

■ کیا تنہا نئے مسائل کی جستجو ہی نئے ادب کی تخلیق کے لیے کافی ہے؟

جواب: کافی ہو یا نہ ہو لیکن ادب کی تخلیق میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ کیا آپ نے علامہ اقبال کا یہ شعر نہیں سنا۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

■ لڑکوں کی نئی نسل طالب علم کی حیثیت سے کیسی ہے؟

جواب: ہر سال ہزاروں لڑکے معاش کے بہتر وسائل سے جڑ رہے ہیں یہ صورت حال کا اچھا پہلو ہے۔ برا پہلو یہ ہے کہ سیاسی مداخلت کی وجہ سے تعلیمی نظام میں خلل واقع ہوتا رہتا ہے۔ طلبہ کا ذہن پختہ ہوتا ہے۔ نااہل اساتذہ اپنے مقاصد کے لیے انھیں استعمال کرتے ہیں۔ اجتماعی مظاہروں کے لیے انھیں اکسایا جاتا ہے۔ یونین بازی کراکے ان کے ذوق اور شوق کو مجروح کیا جاتا ہے۔

■ اس کے ذمہ دار سراسر اساتذہ ہیں؟

جواب: بڑی حد تک۔ اہل، قابل اور محنتی اساتذہ اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتے۔

■ اعلیٰ تعلیم کا حصول کیا سہولیات پر منحصر ہوتا ہے؟

جواب: لگن اور تعلیم کا شوق ہو تو ہر شخص سہولتوں کے فقدان کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتا ہے۔

■ آج کے طلبہ تعلیم سے بیزار بھی نظر آتے ہیں۔ کیا آپ نے بھی ایسا محسوس کیا ہے؟

جواب: نئی نسل کے طلبہ کی اکثریت اوسط ذہن کے اندر عمومی صلاحیتوں والے نوجوانوں پر مشتمل ہوتی ہے جو کسی نہ کسی طرح یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرکے ملازمت کے خواہش مندوں کی قطار میں کھڑے ہوجاتے ہیں، یہ بیزار اس لیے ہوتے ہیں کہ تعلیم ان کا شوق نہیں مجبوری ہوتی ہے۔

■ کیا آپ مروجہ اردو نصاب سے مطمئن ہیں؟

جواب: نہیں، جب تک نئے فارمولے اور نئے نظریات شامل نہیں ہوں گے نصاب اپٹوڈیٹ نہیں کہلائے گا۔

■ ہمارے یہاں علامتی شاعری کن مرحلوں سے گزری اور گزر رہی ہے۔ اردو میں اس کی ترقی کے کیا امکانات ہیں؟

جواب: شاعری اگر علامتی نہیں تو سرے سے شاعری ہی نہیں۔ اس شاعری کی ترقی کے امکانات بے حد و بے پایاں ہیں۔

■ فن اور مواد میں کس کو کس پر ترجیح دیتے ہیں؟

جواب: کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ ادب العالیہ کی تخلیق کے لیے دونوں کا ہم رشتہ ہونا ضروری ہے ۔

اختلاط حرف و معنی ارتباط جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

■ ملکی اور غیر ملکی شاعروں میں آپ کن کن سے متاثر ہوئے ہیں؟

جواب: غیر ملکی شعرا میں انگریزی میں شیکسپیر، کیٹس، شیلی۔

فارسی میں رومی، حافظ، سعدی، فردوسی اور ملکی شعرا میں میر، غالب، اقبال، انیس، جگر، حفیظ، ٹیگور اور وارث شاہ۔

■ حسن وعشق سے متعلق آپ کا نظریہ؟

جواب: ؎ گر عشق نہ بودے، غم عشق نہ بودے
چندیں سخن نغز کہ گفتے کہ شنودے

■ زندگی نے آپ کو کہاں کہاں دھوکے دیے؟

جواب: زندگی کے بارے میں میرا یہ نظریہ ہی نہیں ہے کہ زندگی دھوکا دے سکتی ہے۔

■ اپنی زندگی کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ جس سے آپ متاثر ہوئے ہوں؟

جواب: ایسے واقعات تو بہت ہیں لیکن اب دبی چنگاریاں سلگانے سے کیا حاصل۔

□□□

پتہ:
Koh-Saar,
Bhikanpur-3,
Bhagalpur-81200
(Bihar)

تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

مصنف: تاراچند

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی ایک مبسوط تاریخ جو ڈاکٹر تاراچند جیسے مؤرخ نے قلم بند کی ہے۔ جلد اوّل میں یورپ میں نیشنلزم کا ارتقا، مغلیہ سلطنت کے زوال، جلد دوم میں 1857 سے لے کر 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام، جلد سوم میں 1885 سے تحریک عدم تعاون اور چوتھی جلد میں 1918 سے 1947 تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

(مکمل سیٹ: چار جلدوں میں) صفحات: 2728، قیمت -/794 روپے

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت -/216 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

سید احتشام حسین (ہماری مطبوعات)

نشاۃ ثانیہ کی اردو شاعری

نئی شاعری کے معمار مولانا محمد حسین آزاد سمجھے جاتے ہیں۔ غدر کے بعد جب آزاد نے لاہور کے محکمۂ تعلیم میں سرکاری نوکری کرلی تو وہاں انھیں کئی انگریز فاضلوں کے ربط میں آنے کی خوش بختی میسر ہوئی۔ وہ خود دلّی کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔ فکر وعلم کے نئے رجحانات سے آشنا تھے اور جب انھیں ان انگریزی افاضل نے ترغیب دی، تو انھوں نے نئی شاعری کا خاکہ اپنے رفقا اور ہم وطنوں کے سامنے رکھا۔ اگست 1867 میں انھوں نے ایک خطبہ دیتے ہوئے مشرقی شاعری خاص کر اُردو فارسی شاعری کے نقائص کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ شاعری کو انسانی زندگی اور فطرت کے سبھی اجزا پر روشنی ڈالنے کا فریضہ اٹھانا چاہیے جو بدنصیبی سے نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ ہماری شاعری کو محض کچھ موضوعات میں ہی محدود ہوکر بھی ہمارے اسلاف نے عظیم تخلیقات کی ہیں مگر اب تک ہم انھی کی لکیر پیٹ رہے ہیں اور انھی کے چبائے ہوئے نوالے کھا رہے ہیں۔ ہمارے سامنے جو نئے مسائل ہیں ان کی طرف ہم آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ انھیں خیالات کو بڑے جذباتی اور دلچسپ الفاظ میں تفصیل کے ساتھ پیش کرکے آزاد نے یہ اپیل کی کہ ہمارے شاعروں کو بھی اپنی کال کوٹھری سے باہر آنا چاہیے اور نئی فضا میں نئے راستوں پر چلنا چاہیے۔

نئی تعلیم اور نئے سماجی شعور کی بدولت جو بدلتی ہوئی اقتصادی حالت کا نتیجہ تھا ان کے یہ خیال بے کار نہیں گئے اور کچھ ہی دن گزرنے پر لاہور میں ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد پڑی اور آٹھ مئی 1874 کو وہ پہلا یادگار مشاعرہ ہوا جس میں نئے طرز کی نظمیں پڑھی گئیں۔ پہلے مولانا آزاد نے ایک بہت عمدہ اور بے حد معلومات افزا خطبہ دیا اور پھر شاعری میں اصلیت سے کام لینے، مقامی رنگ پیدا کرنے اور زندگی کی سچی مصوری کرنے کی استدعا کی اور کہا کہ ہم کوئل، چمپا اور چنبیلی، ارجن اور بھیم، گنگا اور جمنا ہمالیہ اور دوسری مقامی چیزوں کو بالکل بھول گئے ہیں، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان کی طرف بھی پورا دھیان دیں۔ وہ ان روایات سے روگرداں نہیں ہونا چاہتے تھے جو پہلے سے چلی آرہی تھیں ان کا خیال تھا کہ شاعری کو اس زندگی کی قیادت کا بار قبول کرنا چاہیے جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس خطبے کے بعد آزاد نے ایک نظم پڑھی جو رات کی مختلف صورتوں کی عکاسی کرتی تھی۔ آزاد کوئی غیر معمولی شاعر نہیں تھے، مگر ایک نئے رنگ کے موجد ہونے کی بدولت ان کی بڑی اہمیت ہے۔ لاہور کے مشاعروں نے مولانا حالی کو بھی اپنی طرف کھینچا اور انھوں نے اپنی کچھ عظیم تخلیقات اسی مشاعرے کے لیے لکھیں اور تھوڑی ہی مدت میں یہ نیا طرز سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ جب تاریخی اور سماجی اسباب سے کسی کام کے لیے مناسب زمین تیار ہوجاتی ہے تو اس کے پھلنے پھولنے میں دیر نہیں لگتی۔ اس وقت کا ہندوستان اس کے لیے تیار ہوگیا تھا کہ اس میں قومی خیالات اور حب الوطنی کے جذبات ظاہر کیے جائیں اور غدر کے بعد ناامیدی کی جو لہر پھیلی ہے اسے مٹایا جائے۔ اس لیے قدامت پسندوں کی مخالفت کے باوجود نئے ادب نے جنم لے ہی لیا۔ آزاد کی نظموں کا ایک مجموعہ ''نظمِ آزاد'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ اس میں ان کی وہ دونوں تقریریں بھی شامل ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ آزاد شاعری میں ذوقؔ کے شاگرد تھے اور شروع میں وقت کی روایت کے مطابق غزلیں لکھتے تھے، کچھ قصیدے اور مرثیے بھی لکھے ہیں، مگر جو کچھ قوت ہے وہ ان کی ان نئی نظموں میں ہے جن کا ذکر ہوچکا ہے۔ آخر میں جب آزاد کی دماغی حالت بگڑ گئی تھی، تو انھوں نے صوفیانہ انداز کی غزلیں لکھنا پھر شروع کر دیا تھا جن میں سے بیشتر ضائع ہوگئیں۔ نمونے کے لیے ان کی ایک نظم کے دو بند دیے جاتے ہیں:

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں، چلے چلو
ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو
ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائیں گے
دشمن فلک بھی ہوں گے تو سر کو جھکائیں گے

''اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' سے ماخوذ، از: سید احتشام حسین، صفحات۔ 341، قیمت : -/66

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے
نیکی کے دَور اُٹھ کے بدی کو دبائیں گے
بیٹھوں نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو

اس عہد کے سب سے بڑے شاعر مولانا حالی تھے اور سچ یہ ہے کہ انھوں نے ہی نئے ادب کی نیو مضبوط کی۔ وہ 1837 میں پانی پت میں پیدا ہوئے تھے، ان کا نام خواجہ الطاف حسین تھا۔ ابھی وہ نو برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ والد راہیِ عدم ہوئے، ماں پہلے ہی سے دماغی مرض میں مبتلا تھیں اس لیے حالی کو ان کے بھائیوں نے پالا، انھی کی نگرانی میں ان کی تعلیم ہوئی۔ تھوڑے ہی زمانے میں انھوں نے عربی فارسی کی مروجہ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مگر ابھی وہ صرف سترہ سال کے تھے کہ بھائیوں نے بیاہ کا پھندا گلے میں ڈال دیا۔ حالی کے لیے یہ ایک سخت بندھن ثابت ہوا کیونکہ وہ ابھی اور تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن جب بیوی گھر میں آگئی تو انھیں یہ فکر ہوئی کہ زیادہ بوجھ بھائیوں پر نہ ڈالیں۔ حالی کی خوش نصیبی سے ان کی رفیقۂ حیات کا خاندان بہت خوش حال تھا۔ انھوں نے اس بات سے فائدہ اٹھایا اور ایک دن جب ان کی بیوی اپنے میکے گئی تھیں حالی بغیر کسی کو بتائے ہوئے چپکے سے پیدل دلی چل دیے اور بڑی غربت سے دلی کے علما سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب دلی کالج قائم ہو چکا تھا اور اس میں بہت سے لوگ نئی تعلیم حاصل کر رہے تھے، مگر حالی اس میں داخل نہ ہو سکے۔ دلی میں انھوں نے پہلے پہل عربی میں ایک چھوٹی سی کتاب ایک مذہبی مسئلے پر لکھی اور یہ ان کا اس زندگی کا آغاز تھا جسے ہم ایک سچے ادیب کی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی نثری تصنیفات کا بیان آگے آئے گا یہاں صرف اس مسلسل کہانی کو منقطع ہونے سے بچانے کے لیے ان کی تصنیفات کے نام لے لیے جائیں گے۔

ابھی غدر نہیں ہوا تھا دلی اپنی آخری رونق اور بہار دکھا رہی تھی۔ بڑے بڑے شاعر اور عالم وہاں موجود تھے جن میں مرزا غالب کا نام و اکرام سب سے زیادہ تھا۔ حالی نے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ وہ کسی طرح غالب کے پاس پہنچے اور اپنا کلام سنایا۔ سترہ اٹھارہ سال کے ایک نوجوان کی عمدہ غزلیں سن کر غالب چونک پڑے اور کہا کہ ”میں کسی کو شاعری میں وقت گنوانے کی صلاح نہیں دیتا مگر تمھاری نسبت میرا خیال یہ ہے کہ اگر تم شاعری نہ کرو گے تو ظلم کرو گے“ اب کیا تھا حالی کا حوصلہ بڑھا اور وہ دلی کے مشاعروں میں حصہ لینے لگے۔ گھر والوں کو پتہ چلا کہ وہ دلی میں ہیں تو جا کر انھیں پانی پت واپس لائے۔ 1856 میں حصول معاش کے لیے گھر سے نکلے اور حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں نوکری کر لی۔ ابھی کچھ دن نہ گزرے تھے کہ غدر ہو گیا اور حالی بڑی دشواری سے جان بچا کر پانی پت بھاگے مگر ان کی صحت بگڑ گئی اور تمام زندگی اس سے پیچھا نہ چھوٹا۔ گھر پہنچ کر انھوں نے پھر اپنی تعلیم کی طرف توجہ کی اور خود کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنی قابلیت بڑھاتے رہے۔

غدر ختم ہوا تو پھر معاش کی فکر ہوئی اور دلی پہنچے۔ یہاں ان کی ملاقات شیفتہ سے ہوئی اور انھوں نے اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے حالی کو نوکر رکھ لیا۔ نوکری تو صرف ایک بہانہ تھی۔ شیفتہ خود حالی سے شاعری اور ادب کی گفتگو کرتے تھے اور حالی نے شیفتہ کے علم اور تنقیدی مزاج سے بے مثال قوت حاصل کی۔ 1869 میں شیفتہ اور غالب دونوں کی موت ہو گئی اور حالی کے لیے دلی اجڑ گئی، ان کی زندگی نے پلٹا کھایا اور انھوں نے لاہور کا راستہ پکڑا۔ وہاں پنجاب گورنمنٹ بکڈپو میں انھیں ایک چھوٹی سی نوکری مل گئی۔ وہاں ان کا کام انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی زبان کی اصلاح بھی تھا۔ چار سال یہ کام کرتے رہے حالی نے اس بارے میں خود لکھا ہے کہ انھوں نے ایک نئی روشنی دیکھی اور انھیں انگریزی ادب کی بہت سی خوبیوں میں پرکشش قوت دکھائی دی۔ اس کے برخلاف فارسی اور اردو نظموں کی تنقید میں حظ حاصل ہونے لگا۔ حالی انگریزی بہت کم جانتے تھے، مگر انھوں نے اس کی خوبیوں کو دلنشیں کر لیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت آزاد کے بنا کردہ نئے مشاعرے بھی ہو رہے تھے۔ حالی پوری طرح اس نئی ادبی تحریک میں شامل ہو گئے اور ان میں وہ اہم تبدیلی ہوئی جس نے ادب اور شاعری کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بدل دیا۔

لاہور میں ان کی تندرستی بگڑ گئی اور وہ دلی چلے آئے۔ یہاں ان کو دلی کالج میں ملازمت مل گئی اور ان کی دلی میں رہنے کی تمنا پوری ہوئی۔ اس وقت تک وہ کئی عظیم نظمیں اور کئی نثر کی کتابیں لکھ چکے تھے۔ یہاں صرف ان کی منظوم تخلیقات کے بارے میں کچھ اشارہ کیا جائے گا۔ دلی کے دوران قیام میں ان کی سرسید سے ملاقات ہوئی جو غدر کے بعد سے مسلمانوں کے ایک بڑے رہنما گنے جانے لگے تھے۔ انھوں نے حالی سے مسلمانوں کے عروج و زوال پر ایک نظم لکھنے کی استدعا کی اور حالی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف، ”مد و جزر اسلام“ 1879 میں لکھی جو ”مسدس حالی“ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ویسے تو حالی سرسید کی قائم کی ہوئی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں نظمیں پڑھا ہی کرتے تھے، مگر اس ممتاز تخلیق نے ان کی ناموری چاروں طرف پھیلا دی۔ 1887 میں انھوں نے اپنی دوسری نظم ”مناجات بیوہ“ لکھی اور اسی طرح برابر ایسی نظمیں لکھتے رہے جو سماج کی اخلاقی اصلاح اور احیائے نو سے تعلق رکھتی ہیں۔

مسدس تو پچیسیوں بار شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں کے نہ جانے کتنے ایڈیشن دوسرے مجموعوں میں نکل چکے ہیں۔ ”دیوان حالی“ میں ان کی غزلیں اور چھوٹی چھوٹی دوسری نظمیں، ”مجموعہ نظم“ حالی میں ان کی دوسری بڑی بڑی نظمیں جمع کر دی گئی ہیں اور سبھی طویل نظمیں الگ الگ شائع ہو چکی ہیں۔ حالی نے اپنے مجموعوں کے مقدموں میں اپنے مقاصد و خیالات کا بیان واضح طور سے کیا ہے۔ اس سے ان کے مطالعے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

آخر میں مولانا حالی کو دربار حیدر آباد سے ایک طرح کا ادبی وظیفہ ملنے لگا تھا اور وہ سکون واطمینان کے ساتھ تخلیق ادب میں لگے رہے۔ 1904 میں انھیں شمس العلما کا خطاب ملا، جس کو انھوں نے قبول تو کرلیا مگر خوش نہ ہوئے۔ 1914 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

جیسا کہ اس وقت کا رواج تھا حالی نے بھی ابتدا میں غزلیں کہیں۔ انھوں نے اس بات کو خود تسلیم کیا ہے کہ وہ میر، غالب اور شیفتہ سے متاثر ہوئے تھے۔ یہ تینوں شاعر غزل میں اصلیت اور قلبی جذبات کو بے حد سنجیدگی اور خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے حالی کی غزلیں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں ان کے شعر دل میں تیر کی طرح چبھ جاتے ہیں۔ قلبی کیفیتوں اور محبت کے احساسوں کا ایسا دلکش بیان ہوتا ہے کہ ان کے سادہ لفظوں میں بجلیاں چھپی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ساری باتیں ابتدائی دور میں تھیں، نئی شاعری سے رشتہ جوڑنے کے بعد انھوں نے غزلوں میں بھی اخلاقی، اصلاحی اور قومی فلاح کا بیان شروع کردیا۔ ان کی بڑی نظموں میں 'مسدس' مناجات بیوہ، برکھارت، حب وطن، چپ کی داد وغیرہ بہترین تخلیقات میں شمار ہوتی ہیں ان کے مطالعے سے صرف حالی کی صاحب دل اور وزن و وقار کا نشان نہیں ملتا، بلکہ اس وقت کے ہندوستان میں اصلاح و ترقی کی جو ولولہ آمیز لہر دوڑ رہی تھی۔ اس کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ انھوں نے کہیں اپنے اس جذبے کو چھپایا نہیں ہے کہ وہ شاعری سے ملک کو بیدار کرنے کا کام لینا چاہتے تھے۔ حالی مسلمانوں کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اس وقت اس طبقے کے مسائل بہت پیچیدہ شکل اختیار کر چکے تھے۔ نئے معاشی حلقے میں داخل ہوکے اور نئی تعلیم حاصل کرکے قدیم روایات سے ناتا توڑ لینے کی خواہش پیدا ہوتی تھی اور کوئی انقلابی نقطۂ نظر نہ ہونے سے ترقی کا یہ جذبہ صرف ایک طرح کی اصلاح پسندی میں محدود ہوکر رہ جاتا تھا۔ اسی لیے حالی کا شعور بھی دو عملے میں پھنسا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔ وہ محب وطن اور وفادار سرکار دونوں ہی بننا چاہتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت سرکاری وفاداری ہی کی آڑ میں آگے بڑھنے کا موقع مل سکتا تھا کیونکہ غدر کے بعد مسلمانوں میں جو ناامیدی پھیلی تھی اس سے باہر نکلنا صرف اسی طرح ممکن تھا کہ نئی زندگی کو قبول کرلیا جائے اور انگریزوں سے لڑ کر نہیں انھیں اپنی وفاداری کا یقین دلا کر ان سے اپنے لیے حق حاصل کیا جائے۔

حالی شاعری کے ذریعے بیداری کا پیغام دینا چاہتے تھے اور اس وقت شعر گوئی کا ایسا انحطاط ہوچکا تھا کہ لوگ محض لفظی گورکھ دھندا، صنائع اور چٹپٹی باتوں میں مزہ پانے کو شاعری کا مقصد سمجھتے تھے۔ اس لیے حالی کی بڑی مخالفت کی گئی اور ان کے نقطۂ نظر کی سخت تنقید کی گئی۔ مگر حالی اپنی دھن کے پکے تھے۔ انھوں نے اپنا راستہ نہیں چھوڑا یقینی طور پر ترقی کی تاریخی طاقتیں ان کو مدد دے رہی تھیں۔ اس لیے تھوڑی مدت کے بعد متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ حصے میں ان کی نظمیں بڑے چاؤ سے پڑھی جانے لگیں۔ حالی اپنے مزاج سے ایک واعظ اور معلم تھے۔ نظم جب تک بے حد دلچسپ خوبصورت اور فرحت بخش نہ ہو پند و تعلیم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ حالی کبھی کبھی فنی اعتبار سے یہ خصوصیتیں پیدا کرنے میں ناکام رہ جاتے تھے۔ اس لیے وہ لوگ جوان کے نصائح سے متفق نہ تھے وہ اسے بے مزہ پاتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حالی کے دل میں جو کچھ تھا وہی ان کی زبان پر آتا تھا۔ ان کے دل میں جو شعلے بھڑک رہے تھے اس وقت تھوڑے ہی سے لوگ اس سے واقف تھے۔ ان کی دوراندیشی جس مستقبل سے دوچار تھی اس کا خاکہ عام لوگوں کے سامنے نہ تھا، اس لیے بہت سے لوگ ان کی نظموں کو محض پند و نصائح کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے۔

حالی صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے ایک بڑے نقاد بھی تھے وہ شاعری کے بنے بنائے ڈھرے پر چل کے سستی ہر دل عزیزی حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ نئی شاعری کے موجد بننے کی تمنا کرتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے مخالفوں کی تلخ تنقید کی پروا کیے بغیر اس نئے اسلوب کی نشر واشاعت کی جو انھیں اپنے اغراض و مقاصد کی تبلیغ کے لیے زیادہ کارآمد معلوم ہوتا تھا۔ ان کی زبان آسان، خیال سنجیدہ اور طرز نیا تھا چونکہ انھوں نے زندگی اور ادب کے رشتے کو سمجھ لیا تھا اس لیے وہ کبھی محض کہنے کے لیے شاعری نہیں کرتے تھے ان کا مقصد بھی فن کی نسبت فن پسندوں کی طرح نہ تھا۔ اس لیے جتنا وقت گزرتا جاتا ہے حالی کی برتری اور احترام میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ نئی شاعری کے پیامبر مانے جاتے ہیں اور اپنی بہت سی خامیوں کے باوصف ان کی ترقی پسندی آج بھی بے یقینی اور تذبذب میں مبتلا رہنے والے شاعروں کے لیے خضر راہ ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں ہندوستان کی دوسری زبانوں میں منتقل ہوچکی ہیں یہاں محض نمونے کے لیے کچھ شعر دیے جاسکتے ہیں۔ مناجات بیوہ میں کہتے ہیں:

ریت کی سی دیوار ہے دنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہو یاں کا
ناؤ کا سا سنجوگ ہے دنیا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے
اس نگری کی ریت یہی ہے
تیرے سوا یاں اے مرے مولا
کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا

بس اے ناامیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کو ڈھارس بندھا تو
فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے
بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے
اجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اجالا کیا ہے

غزل کے تین شعر دیکھیے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہاں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
قلق اور دل کا سوا ہوگیا
دلاسا تمھارا بلا ہوگیا

حالی نے نہ تو کھل کر ہندوستان کی سیاست میں حصہ لیا اور نہ واضح طور سے ایسی نظمیں لکھیں تھیں جن میں سیاسی مسائل کا بیان ہو، مگر جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا یہ بات عیاں ہوتی جاتی تھی کہ ہندوستان میں فن اور زندگی کا رشتہ اس وقت تک واقعی نہیں ہوسکتا، جب تک کھل کر یہاں کی سیاسی کیفیت کا ذکر نہ کیا جائے۔ نئے شعور کے نتیجے میں 1885 میں کانگریس جنم لے چکی تھی وہ ایک چھوٹی سی ٹھنڈی چنگاری تھی جو اقتصادی اور سماجی بدحالی کی ہوائیں کھا کر شعلۂ جوالا بن گئی اور ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ ہندوستان کے عوام اس کی طرف پرامید نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس وقت اس کو نہ پوری طرح سے اونچے طبقے کی ہمدردی حاصل تھی اور نہ نچلے طبقے کے لوگ اس میں شریک تھے۔ برطانوی راج کے فیضان سے فرقہ وارانہ جماعتیں بن رہی تھیں اور بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا وغیرہ۔ فرقہ واریت کے جھنڈے لے کر میدان میں اتر آئیں۔ یہ انگریزوں کی بڑی زبردست فتح تھی کیونکہ ایک طرف اس سے قومیت کا مورچہ کمزور ہوتا تھا، دوسری طرف عوام الناس اپنے اقتصادی اور سماجی مسائل کا حل انھی مذہبی جماعتوں میں ڈھونڈ ھتے تھے اگر بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کی حالت کو دیکھا جائے تو ظاہر ہوگا کہ سیاست اور فرقہ واریت کو ملا کر اصلاح کی طرف پیش قدمی کی کوشش بھی اسی طرح جاری تھی جس طرح سے قوم پرستی کے مورچے کو مستحکم کرکے اس بارے میں بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مذہبی ہونے اور فرقہ پرست ہونے میں بڑا فرق ہے اور ہندوستان کی تاریخ میں اس فرق کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔

کئی مذہبی تنظیمیں غیر ملکی حکومت کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں شامل تھیں، مگر فرقہ پرست جماعتیں کسی نہ کسی صورت سے انگریزی راج کی مددگار ثابت ہوتی تھیں۔ اردو شاعری میں بیشتر آزادی کی لہر اونچی اور فرقہ پرستی کا رنگ پھیکا ہے۔ اس وقت کے دو بڑے شاعر شبلی اور اکبر جو مذہبیت کو زندگی کا سب سے اہم جزو سمجھتے تھے، انگریزی راج کے خلاف اظہار جذبات میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ مولانا شبلی جن کا ذکر نثر نگاروں کے ساتھ آئے گا، فارسی اور اردو کے ایک بڑے شاعر تھے۔ مسلم لیگ بن چکی تھی اور مسلمانوں کو متحدہ قومیت سے دور کھینچنے کی کوشش کررہی تھی۔ مولانا شبلی نے اپنی بہت سی نظموں میں بڑے جوش اور قوت سے مسلم لیگ کی تنقید کی۔ وہ انگریزی راج کی مخالفت ایک مذہبی فریضہ بھی جانتے تھے اور مسلمانوں کو جگاتے ہوئے انھیں غلامی کے بندھنوں کو توڑنے کی نصیحت کرتے تھے۔ ان کے کلام میں طنز کی مقدار زیادہ ہوتی تھی کیونکہ دشمنوں پر چوٹ کرنے میں طنز ایک بڑا ہتھیار ثابت ہوتا ہے۔ ان کے اسی رنگ کو کچھ دن بعد مولانا ظفر علی خان نے چمکایا اور سیکڑوں نظموں میں انگریزی حکومت اور اس کے مظالم کی شدید تنقید کرکے بار بار جیل گئے۔ مولانا شبلی نے بہت سی نظمیں نہیں لکھیں پھر بھی ان کا مجموعۂ کلام قابل مطالعہ ہے۔ انھوں نے ایک مثنوی ''صبح امید'' بھی لکھی ہے، جس کا موضوع مولانا حالی کے مسدس سے ملتا جلتا ہے۔ ان کی نظموں میں ''عدل جہانگیر'' اور ''شہر آشوب اسلام''، مشہور ہیں۔ مثال کے لیے کچھ شعر ذیل میں دیے جاتے ہیں۔ انگریزوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پہ ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا قصہ غم سے تمھارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

اکبرالٰہ آبادی جن کا پورا نام سید اکبر حسین تھا مزاح و ظرافت کے عظیم شعرا میں شمار ہوتے ہیں وہ 1846 میں الٰہ آباد کی تحصیل بارہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے زمانے کے دستور کے مطابق چھوٹے مکتبوں میں حاصل کی اور کئی چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی کیں۔ 1866 میں مختاری کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور نائب تحصیلدار بنادیے گئے۔ 1870 میں ہائی کورٹ میں ایک جگہ مل گئی اور انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا۔ کچھ مدت تک وکالت کرکے سب جج ہوگئے اور 1903 تک کسی نہ کسی شکل عدلیہ سے

متعلق رہے۔ اسی درمیان انھیں خان بہادری کا خطاب بھی مل گیا تھا اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی چن لیے گئے تھے۔ اکبر کی موت 1921 میں ہوئی اور الٰہ آباد میں دفن کیے گئے۔

اکبر وحید الٰہ آبادی کے شاگرد تھے جو زیادہ تر غزلیں کہتے تھے، غالباً اسی اثر سے اکبر بھی شروع میں غزلیں ہی لکھتے تھے جن میں کبھی کبھی تصوف کے خیال ہوتے تھے۔ زیادہ تر لکھنؤ کا رنگ ان پر چھایا ہوا تھا۔ جوانی میں موسیقی سے بھی انھیں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور کچھ دوست ایسے مل گئے تھے جن کی صحبت میں برے راستوں پر چلنے لگے تھے۔ مگر ان کے مزاج میں ایک طرح کی مذہبیت اس طرح رچی ہوئی تھی کہ وہ بہت جلد سنبھل گئے۔ مذہب اور اس کے رسوم کو ہمیشہ اپناتے رہے۔ عقائد پر ان کو دل سے اعتقاد تھا، شاید اسی وجہ سے مزاج کے ظرافت پسند ہونے پر بھی غیر معمولی دلچسپی ظاہر کرتے رہے۔ انھوں نے 1866 کے آس پاس شاعری شروع کی۔ ان کے تین مجموعے کئی بار شائع ہو چکے تھے۔ چوتھا مجموعہ ان کے انتقال کے بعد چھپا۔ کچھ اور نظمیں اور مضامین ان کے خاندان میں موجود ہیں۔

اکبر کا عہد ہندوستانی زندگی میں عظیم تبدیلیوں کا دور تھا اور اکبر کی بڑائی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے وقت کی مختلف اقسام کی جدوجہد کو شعوری طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی اور چھوٹے بڑے سبھی واقعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ یہ ایک نئی قسم کی حقیقت پسندی تھی جس میں روز ہونے والی باتوں کو ظرافت اور طنز کا لباس پہنا کر خوبصورت نظم کی شکل میں انھوں نے کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔

اکبر جب جوان ہوئے تو ہندوستان پوری طرح انگریزوں کے قبضے میں آ چکا تھا اور غدر کی مصیبتوں کے بعد مسلمانوں کا متوسط طبقہ انگریزی راج سے سمجھوتہ کر چکا تھا۔ اکبر بھی سرکاری نوکر بن چکے تھے، مگر ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ملک کی بدحالی ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ نئی زندگی کے مسائل اتنے پیچیدہ تھے کہ اکبر کبھی ان سے منھ موڑ کے ماضی کی طرف لوٹ جاتے تھے اور اسی کے گن گا کے اطمینان حاصل کر لیتے تھے اور کبھی اس کے سامنے شکست خوردہ ہو کر مایوسی کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ شروع میں ان کے یہاں مزاح اور طنز کا پتہ نہیں چلتا، مگر 1885 کے بعد سے انھوں نے اسی کو اپنی شاعری کا خاص ذریعہ بنا لیا۔ اکبر کی تعلیم جو کچھ تھی اور جن روایات کے درمیان انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور وقت کی حالت کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں تھیں، اس لیے وہ علم کے بدلے باطنی تحریک پر بھروسہ رکھتے تھے اور اسے خیالوں ہی کی مدد سے عصر نو کے مسائل کو حل کر لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے خیالات میں مشرق و مغرب میں ایک معین تقسیم کر لی تھی اور سارے اخلاقی اور مذہبی اوصاف ان کو پورب ہی میں دکھائی پڑتے تھے۔ مغرب صرف اپنی حیوانی طاقت کی بنا پر مشرق کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ انھیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ مغربی اثر صرف ملک کے مادی ذرائع کو ہی تباہ نہیں کر دے گا بلکہ اس کی روحانیت پسند مزاج کو بھی ملیامیٹ کر ڈالے گا، اس لیے ان کے قلم میں جتنا زور، ان کے خیالوں میں جتنا جوش اور ان کے الفاظ میں جتنا زہر تھا۔ اس سب سے کام لے کر اکبر مشرق کو مغرب سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اکبر یہ جانتے تھے کہ اس طوفان کو روکا نہیں جا سکتا کیونکہ عملی زندگی میں مغرب کے آئے ہوئے خیالوں سے فائدہ اٹھانا ناگزیر تھا۔ اسی لیے ان کے بہت سے خیال رجعت پسندوں سے مل جاتے ہیں۔ وہ کسی عالم میں بھی سائنس اور نئے خیالات کو سودمند نہیں سمجھتے تھے۔ یہ ایک طرح کی مثالیت پسندی تھی، جو زندگی کے روحانی نقطۂ نظر کا ثمرہ کہی جا سکتی ہے۔ ان کی شاعری میں تصوف کا بھی کچھ حصہ تھا، وہ بھی انھیں مثالیت پسند بناتا تھا۔ وہ زندگی کی تبدیلیوں کو حقیر جانتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ جو لوگ نئے شعور کا ساتھ دے رہے ہیں، وہ اخلاقی اصولوں پر ضرب لگا رہے ہیں۔ ان خیالوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انگریزی زبان و ادب کے فیضان سائنس کی واقفیت، خواتین کی آزادی اور تعلیم، مشین ہر چیز کے خلاف ہو گئے۔ وہ ڈارون، اسپنسر، مل وغیرہ کی ہنسی اُڑاتے تھے اور مقدر پر نا قابل شکست اعتقاد رکھنے کے باعث بدلتی ہوئی صورت حال کی تحقیق سائنسی اعتبار سے نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا آخری سہارا مذہب تھا اور جہاں کہیں سے بھی اس پر چوٹ پہنچنے کا خطرہ ہوتا تھا، اس کی مخالفت کرتے اور طنز کے تیر چلاتے تھے۔

اکبر کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے انگریزی راج کی معاشی لوٹ گھسوٹ کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ ان کی تہذیب کی خارجی صورت کو ایک نقلی پالش سمجھتے تھے۔ ان کی فرقہ پرستی پیدا کرنے والی مساعی کا پول کھولتے تھے۔ اس طرح مزاح کے اوٹ سے وہ انگریزی راج پر نہایت زوردار حملہ کرتے تھے۔ اور سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی منہ میں آئی ہوئی بات کہنے سے نہ چوکتے تھے۔ اُن کو اس بات کا احساس ضرور تھا کہ وہ دل کی بات کھل کر نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

مدخولہ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

اکبر کی تخلیقات کو بخوبی سمجھنے کے لیے مذہب اسلام، مسلم ثقافت، ہندوستان کی تاریخ اور بیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی واقعات کا جاننا اشد ضروری ہے، کیونکہ ہنسی ہنسی میں وہ ایسی باتوں کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں جنھیں جانے بغیر ان کے طنز سے لطف نہیں لیا جا سکتا۔ وہ انگریزی، فارسی، عربی اور ہندی لفظوں کا استعمال بڑی آزادی سے کرتے تھے اور اپنے دل کی بات کسی نہ کسی مذاقیہ رنگ میں ظاہر کر دیتے تھے۔ اکبر اردو کے ایک عظیم شاعر اور مزاح کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ مثال کے لیے یہ شعر دیکھیے:

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے

بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں وہ دنیا کو ہضم
اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

کیا کہوں اس کو میں بدبختی نیشن کے سوا
اس کو آتا نہیں اب کچھ اگیٹیشن کے سوا

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

کوٹھی میں جمع ہے نہ ڈپازٹ ہے بنکس میں
قلاش کر دیا مجھے دو چار تھینکس نے

کر دیا کرزن نے زن مردوں کی صورت دیکھیے
آبرو چہرے کی سب فیشن بنا کر چھین لی

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہوگیا
'سر' ہوگئے، تو بال کا بھی شوق ہوگیا

بیسویں صدی کے شروع ہونے کے تھوڑی ہی مدت بعد ہی سے اتنے شاعر اور مصنف سامنے آنے لگتے ہیں کہ ان میں سے کچھ ہی کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ نظموں کے ساتھ ساتھ غزل بھی نئے سانچے میں ڈھل رہی تھی اور کچھ نمائندہ شاعر صرف غزلوں ہی کے ذریعے زندگی کے مسائل پیش کرتے تھے۔ ان کا نقطۂ نظر اور ان کا شعور غزل کے ان شعرا سے مختلف تھا جو اس سے پہلے گذر چکے تھے، مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غزل میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں، ان کا پتہ صاف طور سے نہیں چلتا، پھر بھی جب ہم عصر جدید کی غزلوں کا مطالعہ کریں گے تو ان میں نئی آواز اور زندگی کے نئے مسائل کی نسبت نیا نقطۂ نظر ملے گا اس موقع پر صرف انھیں کے بارے میں کچھ کہا جاسکے گا، جو ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ اس وقت کے شعرا میں کئی ایسے بھی ہیں جو غزل اور دوسری اصناف کی نظموں دونوں ہی کی تخلیق میں کامل ہیں مگر ان کی شہرت حقیقتاً کسی ایک ہی وجہ سے ہوتی ہے، جیسے پنڈت رتن ناتھ سرشار شاعر بھی تھے مگر صرف نثر نگار سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح منشی درگا سہائے سرور، پنڈت برج نرائن چکبست اور ڈاکٹر اقبال وغیرہ بڑی عمدہ غزلیں بھی لکھتے تھے مگر ان کی شاعری کی خصوصیات ان کی نظموں میں ہی ظاہر ہوتی ہیں۔

درگا سہائے سرور جہان آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے گھر میں ہمیشہ سے طبابت ہوتی تھی اور فارسی، عربی اور اردو کا چرچا تھا۔ وہیں 1873 میں وہ پیدا ہوئے ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی، مگر وہ خودداری کی وجہ سے اپنی زندگی میں لطف اٹھاتے تھے وہ لڑکپن ہی سے نظمیں لکھنے لگے تھے جو اردو کے مشہور رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ شراب پینے کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ اس سے ان کی تندرستی بالکل تباہ ہوگئی، یہاں تک کہ سینتیس سال کی عمر میں 1910 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سرور کے کلام میں ایک طرح کے غمناک ماحول کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی جذباتیت یا تو پوری طاقت سے حب الوطنی کے خیالات ظاہر کرتے وقت ابھر آتی ہے یا کسی المناک کیفیت کی مصوری کرتے وقت۔ انھوں نے مذہبی اور تاریخی مسائل پر بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں، کچھ نظموں میں حسن فطرت کا بیان بھی بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ سرور انگریزی زبان کم جانتے تھے، پھر بھی انھوں نے تقریباً بیس انگریزی نظموں کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ انگریزی شعرا کی خصوصیتیں مٹنے نہیں پائی ہیں۔ وہ دن رات چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے شاعری ہی میں مگن رہتے تھے اس لیے تھوڑی سی عمر میں ہی انھوں نے بہت کچھ کہہ ڈالا تھا۔ ان کے دو مجموعے "جام سرور" اور "خم خانۂ سرور" شائع ہوچکے ہیں اردو شاعری کے نئے رنگ کو آگے بڑھانے اور حب الوطنی کے خیالات کو بڑھاوا دینے میں سرور کی نظموں نے بڑا حصہ لیا۔ بچپن میں فارسی زیادہ پڑھنے کے باعث ان کی زبان فارسی سے گراں بار اور مشکل ہوگئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تشبیہوں اور صنعتوں کے استعمال نے اسے اور دشوار بنا دیا ہے۔ نمونے کے لیے کچھ شعر دیکھیے:

کسی مست خواب کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گذر گئی شب آدھی، دل بے قرار سو جا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے مست جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غم گسار سو جا
یہ تری صدائے پیہم تجھے مضمحل نہ کردے
مرے پردہ دار سو جا، مرے رازدار سو جا
مجھے خوں رلا رہا ہے، ترا دم بدم تڑپنا
ترے غم میں آہ کب سے ہوں میں اشک بار سو جا

منشی جوالا پرشاد برق، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، پنڈت امرناتھ ساحر وغیرہ بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان میں جو اہمیت چکبست اور اقبال کو میسر ہے وہ کسی اور کو نہیں۔ پنڈت برج نرائن چکبست لکھنؤ کے ایک کشمیری برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ 1882 میں پیدا ہوئے اور 1907 میں کیننگ کالج سے بی۔اے ایل ایل بی پاس کرکے 1908 میں وکالت شروع کی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ یہاں کے سربرآوردہ وکلا میں شمار ہونے لگے۔ 1926 میں ناگہانی طور سے ان کا انتقال ہوگیا۔ چکبست اپنے لڑکپن ہی سے شاعری کرتے

تھے۔ آتش، غالب اور انیس کے کلام کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کرتے تھے اور انھیں سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ اس وقت ہندوستان کی سیاست میں جو ہل چل برپا تھی اور آزادی کی جنگ جس منزل پر تھی چکبست کی شاعری اس کی علامت کہی جاسکتی ہے۔ قومیت نے جڑ تو پکڑ لی تھی مگر ابھی انگریزی راج سے آزاد ہونے کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا، جو انھیں دیس سے نکال باہر کرے، اس لیے چکبست بھی انگریزی راج کے سائے ہی میں 'ہوم رول' حاصل کرنے کا پند دیتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد اور حب الوطنی سے ان کی نظمیں لبریز ہیں۔ ان دونوں خیالات کو انھوں نے اتنی پُر زور تخلیقات میں پیش کیا ہے کہ اس وقت تک ان کی برابری کرنے والے شاعر بہت کم دکھائی پڑتے ہیں۔ بڑے بڑے قومی رہنماؤں کے اسیر ہوجانے اور انتقال پر انھوں نے بڑی پُر اثر تخلیقات کی ہیں اور ملک کے ناموس کے تحفظ کے لیے اپنی جان تک دینے پر آمادہ کیا ہے۔ وہ آزادیٔ خیال کے بڑے پجاری تھے اور اس وقت تقریر و تحریر پر جو پابندیاں عاید کی جاتی تھیں ان کی مخالفت بڑے زوروں سے کرتے تھے۔ انھوں نے کچھ مذہبی اور اخلاقی اصلاح سے تعلق رکھنے والی نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن اگر سب کو ملا کر دیکھا جائے تو ظاہر ہوگا کہ وہ اس وقت کو دیکھتے ہوئے ایک انقلابی شاعر تھے اور کبھی ملک کے قدیم ناموس کی یاد دلا کر کبھی عصرِ حاضر کی اقتصادی تباہ حالی کی تصویر کشی کرکے کبھی کبھی مستقبل کا اندازہ لگا کے، آگے بڑھانا چاہتے تھے، ان کی زبان لکھنؤ کی صاف وشستہ زبان تھی، چکبست بڑے اچھے نثر نگار تھے اور ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے، جس سے ان کے علم، قوت تنقید اور تاریخی و سماجی نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ انتقال سے کچھ دن پہلے انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام ''صبحِ وطن'' شائع ہونے کے لیے بھیج دیا تھا مگر وہ ان کی رحلت کے بعد نکلا۔ یہ مجموعہ دیوناگری رسم الخط میں بھی طبع ہو چکا ہے۔ ملک کی تعریف میں ایک نظم کے کچھ حصے دیکھیے:

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عزّ و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی
گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں
برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
اس کے بھرے خزانے برباد ہو رہے ہیں
ذلت نصیب خواب غفلت میں سو رہے ہیں

اردو ادب کا موجودہ زمانہ نثر کا زمانہ کہا جاسکتا ہے، مگر اس عصر نے ایسے شاعر بھی پیدا کیے جو زندگی کے مسائل کو سمجھنے میں فلسفہ اور منطق، تاریخ اور سماجی سائنس سے کام لیتے ہیں۔ ان کی شاعری نوع انسانی کے نسبت ویسے ہی سماجی اور اقتصادی خیال پیش کرتی ہے جیسے کوئی صاحب فکر مصنف اپنے مقالوں میں بحث و نظر کے بعد پیش کرے گا۔ شاعر کا وسیلہ تصور اور جذباتیت ہوتی ہے۔ انھیں کے ذریعے وہ زندگی کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور داخلی کشمکش کا پتہ لگاتا ہے۔ جو نوع انسانی میں سماج اور فطرت کی ناانصافیوں کے خلاف پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سب سے اچھا اور نفیس بیان ڈاکٹر اقبال کی شاعری میں ملتا ہے، کئی اسباب سے اقبال کی تخلیقات بحث مباحثے کا موضوع بنی ہوئی ہیں، کیونکہ ایک طرف تو مسلمان رجعت پسند انھیں اپنی طرف کھینچتے اور اپنا لیڈر بنانا چاہتے ہیں دوسری طرف ہیں ترقی پسند جو ان کی نظموں میں انسانیت کی نسبت یگانگت اور بیداری پاتے ہیں جسے کسی خاص مذہب سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور تیسری طرف یہ نزاع اٹھ کھڑی ہوتی ہے کہ انھیں ایک شاعر کی شکل میں دیکھا جائے یا فیلسوف کی شکل میں۔ یہاں اس بحث میں پڑنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اقبال کی تخلیقات میں اتنے مذہبی، سماجی، تاریخی اور فلسفیانہ دھارے آکر ملتے ہیں کہ ان کا تجزیہ دو چار صفحوں میں نہیں کیا جاسکتا۔ محض ان کی شاعری کی اصل بنیادوں اور خصوصیتوں کا تعارف اختصار سے کرایا جاسکے گا۔ انگریزی اور اردو میں چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں اقبال پر نکل چکی ہیں اور جو شخص بھی تنقیدی مطالعہ کرنا چاہے گا اسے بہت کچھ پڑھنا پڑے گا۔

اقبال کے بزرگ کشمیری برہمن تھے۔ اقبال نے اپنی نظموں میں بڑے فخر کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے سیالکوٹ میں حاصل کی پھر لاہور چلے گئے۔ دوران تعلیم میں وہ اپنی درسگاہ کے سب سے اچھے طلبہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ فلسفے میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرکے وہ خصوصی تعلیم کے لیے لندن گئے، وہاں انھوں نے بیرسٹری بھی پاس کی اور جرمنی سے فلسفے میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی لی۔ یورپ کا سفر ان کی زندگی کی انقلابی تبدیلیوں کا مظہر ہے۔ اس نے سیاست اور زندگی کے سبھی شعبوں میں

ان کا نقطۂ نظر ایک دم بدل دیا۔ وہاں سے پلٹ کر لاہور میں بیرسٹری کرنے لگے۔ تھوڑے زمانے کے لیے ایک کالج میں پروفیسر بھی ہوگئے۔ تھوڑا بہت پنجاب کے سیاست میں بھی حصہ لینے لگے۔ 1931 میں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے لندن گئے۔ ان کی صحت برابر خراب رہا کرتی تھی۔ 1936 سے حالت بگڑتی گئی اور اپریل 1938 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اقبال کی زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ نہیں ہیں مگر ایک صاحب فکر شخص ہونے کی وجہ سے اندر ہی اندر ان میں زبردست کشمکش اور تبدیلی ہوتی رہی تھی اور وہ دنیا کے تمام واقعات سے متاثر ہوتے رہے تھے۔ ان کا بچپن ایک ایسے باپ کی سرپرستی میں گزرا جو مذہب کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور فارسی کی مذہبی کتابیں اقبال سے پڑھوا کر سنتے اور ان کے رموز پر تبادلۂ خیال کرتے۔ اقبال کو ایسے استاد بھی ملتے گئے جنھوں نے اُن پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ مسلمانوں کے متوسط طبقے میں پیدا ہوئے تھے اور اسی کی نگاہ سے زندگی کے مسائل کو دیکھتے تھے۔ ہندوستان میں بڑے بڑے واقعات اور عظیم تبدیلیاں ہورہی تھیں مسلمانوں میں ایک طرح کی بیداری پیدا ہوچکی تھی جو ان کے دل کو کئی طرف کھینچ رہی تھی۔ ہندوستان کے باہر مسلمان ممالک پر تباہی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور لگ بھگ سبھی ملک یورپ کے پیروں تلے کچلے جارہے تھے۔ یورپ کی تہذیب، ایشیا کی تہذیب کو تباہ کررہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان میں اخلاقی فضائل کے اکتساب کی طاقت ضائع ہوچکی ہے۔ اقبال ان سب باتوں کو سمجھتے تھے اور جب انھیں یورپ میں جاکر رہنے اور وہاں کے حکمراں طبقے کے خیالوں سے آشنا ہونے کا موقع ملا تو یہ بات انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی کہ یورپ کس طرح سارے ایشیا کا خون چوس لینا چاہتا ہے اور اپنی تہذیب پھیلانے کے بہانے ان کی قوت نفس تباہ کردینا ضروری سمجھتا ہے جس سے اسے پسماندہ ممالک پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے میں آسانی ہو۔

ہندوستان میں قومیت کا جو جذبہ بڑھ رہا تھا شروع میں اقبال اس پر فریفتہ تھے مگر یورپ جاکر انھیں ایسے خیالات سے واسطہ پڑا اور قوموں کو آپس میں جھگڑتے دیکھ کر وہ قومیت سے اتنے بددل ہوگئے کہ انھوں نے بیک نظر حب الوطنی اور قومیت کو نوع انسانی کے اتحاد اور ترقی کے لیے بہت نقصان رساں بتایا۔ اس کے بہت سے اسباب تھے مگر انھوں نے جس ماحول میں اسے پوری طاقت سے پیش کیا اس نے ان کے خلاف اور طرح کے شبہے پیدا کردیے۔ رفتہ رفتہ وہ رجعت پسند مسلمانوں کے لیڈر سمجھے جانے لگے کیونکہ ان کے خیالوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح سے ہندوستان کے دوسرے فرقوں سے الگ رکھنا اور ان کا رابطہ باہر کے مسلمانوں سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ اقبال نے ان خیالات کو فلسفیانہ صورت میں پیش کیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کے خلاف نہیں ہیں، مگر دنیا کی پچھڑی ہوئی دوسری قوموں اور بالخصوص مسلمانوں کو ہر طرح کے مظالم سے بچانا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کٹھن ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر کیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے صاف طریقے سے کبھی ان تحریکوں کا ساتھ نہیں دیا، جو ملک کی آزادی کے لیے نبرد آزما تھیں اگرچہ انھوں نے بنی نوع بشر کی روحانی آزادی اور ترقی کے متعلق بہت فیاضانہ اور اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں۔

اگر اقبال کی تخلیقات کا مطالعہ تاریخی حیثیت سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ان روایات کو آگے بڑھا رہے تھے جنھیں سرسید اور حالی کی اصلاح پسند تحریک نے جنم دیا تھا۔ ان کی شاعری میں ایک لہر ایسی بھی تھی جو اکبرالہٰ آبادی کی یاد دلاتی ہے اردو کے سبھی شعرا کی طرح انھوں نے بھی شروع میں غزلیں لکھی تھیں اور اپنا کلام داغ دہلوی کو دکھایا تھا۔ مگر تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد انھوں نے اپنی راہ آپ بنالی اور 1899 میں اپنی پہلی اہم نظم ''ہمالیہ'' لکھی۔ اس کے بعد حسن فطرت، ہندو مسلم ایکتا اور زندگی کی داخلی کشمکش پر بڑی دلچسپ تخلیقات کیں۔ ان میں ایک صاحب فکر انسان کا وہ تحیر ہے جو وہ چاروں طرف بکھری ہوئی حسین چیزوں کو دیکھ کر ظاہر کرتا ہے اور ہر چیز میں زندگی کے اسرار کو تلاش کرتا ہے۔ یہی ابتدائی تحیر آگے بڑھ کر فلسفیانہ اور روحانی سرگذشت کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور اقبال اُردو کے سب سے بڑے فلسفی شاعر بن جاتے ہیں۔

اقبال کی اہمیت یہ ہے کہ وہ مشرق اور مغرب کے فلسفے، مذہب، سائنس، تاریخ اور سیاسی صورت حال ہر ایک بات سے پوری طرح آشنا تھے۔ ان کے سمجھنے کے لیے محض اسلامی خیالات سے بخوبی واقفیت ضروری نہیں، بلکہ دوسرے سبھی عظیم مذاہب ان کے خیالوں اور عصری سائنسوں کا جاننا بھی ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص اسلامی فلسفیوں کے علاوہ افلاطون، نیٹشے، برگساں اور آئنسٹائن سے اچھی طرح آشنا نہیں ہے وہ اقبال کی شاعری کو نہیں سمجھ سکے گا۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ اقبال نے فقط مشہور فلسفیوں کے خیالات کو نظم کی شکل میں لکھ دیا بلکہ کہیں کہیں ان سے اختلاف ظاہر کیا ہے، ان کی تنقید کی ہے اور ان کے انھی خیالات کو قبول کیا ہے جو ان کے نقطۂ نظر کو مضبوط بناتے تھے۔

ان کا نقطۂ نظر کیا تھا، اختصار کے ساتھ یہ بتانا دشوار ہے، مگر تعارف کے طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دنیا میں ایسا ضبط و نظم اور نظم و نسق چاہتے تھے جس کی اساس اسلامی اصولوں پر ہو، جس میں ایکتا ہو اور نوع انسانی میں کسی طرح کا امتیاز نہ ہو۔ انسان صرف اس دنیا ہی پر نہیں چاند، سورج اور ستاروں پر بھی اقتدار حاصل کرلے۔ اس کا باطن پاکیزہ اور دنیا کی کسی مادی قوت کے سامنے وہ اپنی پیشانی خم نہ کرے۔ انسان کو یہ اختیار ہو کہ وہ دنیا میں جیسی زندگی بسر کرنا چاہتا ہو اسی کے مطابق اپنی تنظیم کرے، مگر اسے کبھی خدا کی مرضی کے خلاف

نہیں جانا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی روحانی قوت لامحدود ہے اور اگر وہ اس سے کام لے اور ضبطِ نفس پر چل کر اسے ترقی کرنے کا موقع دے، تو وہ خدا کے تعمیری کام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خدا نے انسان سے اشرف کوئی چیز نہیں پیدا کی اور کائنات کی تخلیق بھی اسی کے مفاد میں کی ہے۔ اس روحانی قوت پر اتنا زور دیا ہے کہ کبھی کبھی وہ صرف ایک روحانی تخیل معلوم ہونے لگتا ہے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی ترقی کے وسائل کیا ہیں۔ یہی بات ان کو حقیقت پسندوں سے ہٹا کر مثالیت پسندوں کے نزدیک کر دیتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ ساری تبدیلیاں حقیقی مادی زندگی میں نہیں بلکہ صرف خیالی دنیا میں چاہتے تھے۔ اقبال صوفیوں کے اس خیال کی شدید مخالفت کرتے تھے کہ انسان کو اپنی خودی کو مٹا دینا چاہیے جس سے وہ ذات خداوندی میں مل سکے۔ اس کے برخلاف اقبال یہ سمجھتے تھے کہ خدا انسان کو اسی وقت اپنے قریب آنے دیتا ہے جب وہ اپنی تمام طاقتوں کو کام میں لائے اور انھیں ترقی کر کے اپنے اندر وہ فضائل پیدا کرے جو اپنی کامل ترین شکل میں خدا میں پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی اقبال کے یہاں ایک نئے طرح کا تصوف دکھائی پڑتا ہے، جس کو ہم عصر حاضر کے روحانی خیالات کہہ سکتے ہیں۔ اقبال نے زندگی کے ہر سنجیدہ مسئلے پر نگاہ ڈالی ہے۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایسا موضوع ہوگا جس پر انھوں نے نظم نہ لکھی ہو۔ خاص کر انھوں نے روحانی قوت، عرفان انسانی اور ہمہ صفت موصوف موصوف۔ فوق البشر فطرت پر انسان کا اقتدار، فرد اور مذہب و معاشرہ سے اس کا تعلق، مشرق و مغرب کے فلسفے وغیرہ پر اردو میں بہت سی نظمیں لکھی ہیں اور اپنے انگریزی خطبات میں بھی ان پر دقیق خیالات ظاہر کیے ہیں۔

اردو میں اقبال کے صرف چار مجموعے ہیں، بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز۔ فارسی میں ان کی کئی کتابیں ہیں، جو اردو مجموعوں سے زائد اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی زبان آسان نہیں تھی لیکن وہ جس طرح کے خیال ظاہر کرتے ہیں ان کے لیے وہی ٹھیک کہی جا سکتی ہے۔ جمالیات کے اعتبار سے ان کی بہت سی تخلیقات اردو فارسی تو کیا، دنیا کی کسی زبان میں اپنی جگہ بنا سکتی ہیں۔ اقبال انسان کی طاقت پر پورا اعتماد رکھتے تھے اور اس کے مستقبل کے ایسے گیت گاتے تھے کہ انھیں جو بھی پڑھے گا ان خیالات کے ترنم اور بہاؤ میں بہنے لگے گا۔ ان کی پوری پوری نظمیں یہاں نہیں دی جا سکتیں، ادھر اُدھر سے کچھ شعر مثال کے لیے لکھے جاتے ہیں:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے آتا ہے کہاں سے
دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں
لوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کے لیے

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں ہم نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ
کہ ہم تو رسم محبت کو عام کرتے ہیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے
عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے
نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

بیسویں صدی میں بہت سے ایسے شاعر پیدا ہوئے جو اُردو ادب کی تاریخ میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ ان میں کچھ کا بیان کیا جا چکا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن پر تفصیل سے لکھنا اس کتاب میں ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تخلیقات قابل مطالعہ نہیں۔ شاد عظیم آبادی، جوالا پرشاد برق، نوبت رائے نظر، مہاراج بہادر برق، جگت موہن لال رواں، امرناتھ ساحر، ریاض خیر آبادی، مولانا صفی، فانی، عزیز، ثاقب، سائل، امرناتھ، آرزو، سیماب، اصغر گونڈوی، ظریف، حسرت موہانی اور ترلوک چند محروم، جگر مرادآبادی، یگانہ چنگیزی، اثر لکھنوی کا انتقال ہو چکا ہے، ان میں سے کچھ ابھی تھوڑے دن پہلے تک حیات تھے، مگر ان کو خاص وجوہ سے 1935 تک کے شاعروں میں گنا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں عصر حاضر کا نیا پن تو ہے مگر وہ نیا شعور جو انقلاب میں مددگار ہوتا ہے یا روایت شکنی کی وہ ہمت جو عصریت کو جنم دیتی ہے۔ ان کے یہاں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ آگے کے باب میں ان شاعروں کا ذکر کیا جائے گا جنھوں نے اس عہد کی بے چینی بے قراری، تخیل، خواب اور توقعات کی عکاسی کی ہے۔ مندرجہ بالا شعرا میں بیشتر ایسے ہیں جو غزل اور دوسری اصناف کی نظمیں بھی لکھتے رہے ہیں اور اپنے زمانے کے رجحانات کو جدت و تازگی کی طرف موڑنے میں حصہ لیا ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو رسم و رواج سے بندھے ہونے پر بھی اپنی انفرادیت کا اظہار کرتے ہیں اور تاریخ میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔

سید علی محمد شاد عظیم آبادی بہار کے دورِ جدید کے چوٹی کے افاضل و شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی مدت حیات 1846 سے 1927 تک ہے۔ انھوں نے نثر و نظم دونوں کو انمول تخلیقیں عطا کی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صفیر بلگرامی کو اپنا کلام دکھاتے تھے مگر انھوں نے اپنا استاد شاعری الفت حسین

فریاد کو مانا ہے۔ شاد نے مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور دوسری اصناف سخن میں تخلیق کی ہے، مگر ادبی نظر سے وہ اپنی غزلوں کے کیف، گھلاوٹ اور اصلیت کے باعث مشہور ہوئے۔ مرثیہ نگاری میں بھی انھوں نے بڑا نام کیا۔ نقادوں کا یہ خیال مبنی برمعقولیت ہے کہ غزل کے روبہ انحطاط اثر کو سنبھالنے میں شاد عظیم آبادی کا خاص حصہ ہے۔ انھوں نے غزل کو نہ صرف سنبھالا بلکہ اس میں ایسی رنگینی و شیرینی بھردی کہ غزل پھر سے زندہ ہوگئی۔ ان کی تمام کتابیں ان کی حیات میں ہی شائع ہوچکی تھیں مگر غزلوں کا دیوان ''نغمۂ الہام'' ان کی وفات کے بعد سامنے آیا۔ اب تو ان کی خودنوشت، سرگزشت اور دوسرے کئی مجموعے بھی چھپ گئے ہیں۔ ان کے بہت سے نظریات سے اختلاف رائے رکھتے ہوئے بھی عصر حاضر کا عظیم شاعر مانا گیا ہے، یہ رائے تقریباً سبھی نقادوں اور عالموں کی ہے۔ ان کی غزل کے کچھ شعر یہ ہیں:

میں اور سیرِ لالۂ و گل ہجر یار میں
کیسی بہار آگ لگا دوں بہار میں
تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
یہ بزم مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
خود چل اس کوچے میں چلنا جو ہے اے پائے طلب
واں کوئی ہاتھ پکڑ کر نہیں لے جانے کا
جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

جوالا پرشاد برق ستیاپور کے رہنے والے تھے۔ جی تک پہنچ کے 1911 میں قفس عنصری خالی کردیا۔ نثر و نظم دونوں کے لکھنے میں کامل تھے۔ آسان زبان میں اظہار خیال انھیں خوب آتا تھا۔ بہار کے موسم پر ایک بڑی دلچسپ مثنوی لکھی ہے۔ مگر زیادہ تر اپنی غزلوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔

نوبت رائے نظر، (1923 ـ 1866) لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے۔ کئی رسالوں کے مدیر رہے لیکن ان کی زندگی بڑی دشواریوں میں گزری۔ صحت بھی بہت خراب رہتی تھی، اس پر گھریلو زندگی کے افکار بھی گھیرے رہتے تھے۔ اپنے وقت میں نثر و نظم دونوں کے اچھے لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کے مصنوعی رنگ سے ہٹ کر شاعری میں اصلاح کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ وہ ظاہری حسن کے بدلے قلب کے درد باطن کا بیان کرنے کو شاعری سمجھتے تھے ان کے دو تین شعر یہ ہیں:

ابھی مرنا بہت دشوار ہے غم کی کشاکش سے
ادا ہوجائے گا یہ فرض بھی فرصت اگر ہوگی

اب نہیں معلوم کیا دنیا میں ہے رنگ بہار
اک زمانہ ہوگیا چھٹے ہوئے گلزار سے
یوں تو دل کو کبھی قرار نہ تھا
اب بہت بے قرار رہتا ہوں

جیسا کہ پچھلے باب میں عرض کیا جاچکا ہے۔ اس وقت کے تقریباً سبھی شاعر کسی نہ کسی طرح سے پرانے طرز میں اصلاح کی طرف بڑھ رہے تھے اور خاص کر لکھنؤ میں شاعری میں زبردست تبدیلیاں ہورہی تھیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس وقت کے شعرا نے قدیم روایات کو بالکل ہی خیر باد کہہ دیا ہو مگر یہ ضرور ہے کہ وہ شاعری کو صرف لفاظی بننے سے بچانا اور اس کے ذریعے گہری باتوں کو پیش کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ کچھ شاعر ایسے تھے جو طرز کہن سے دور نہیں جانا چاہتے تھے جیسے پنڈت ساحر، ساحل، بیخود وغیرہ، مگر ان کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا شعور بھی پرانے شعر کو دیکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ نیا تھا۔ وہ پرانے شعرا میں میر، غالب، آتش، انیس، کا اتباع کرتے تھے اور نئے شعرا میں حالی، اقبال اور سرور کا۔ چنانچہ مہاراج بہادر برق (1936 ـ 1884) جن کے گھر میں کئی پشت سے شاعری کی روایت چلی آرہی تھی، انگریزی شعرا کے علاوہ سرور جہاں آبادی سے متاثر تھے۔ انھوں نے غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔ زبان مشکل اور فارسی سے مملو ہوتی تھی۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوچکے ہیں انھی میں سے غزل کے دو تین شعر دیکھیے:

ظرف سے ٹوٹ کے بھی ہونے نہ پائے بیکار
ہو شکستہ کوئی شیشہ تو وہ پیمانہ بنے
کھلتی نہیں حقیقت دنیائے بے ثبات
اک خواب سا ہے دیدۂ حیراں کے سامنے

صفی لکھنوی (1950 ـ 1863) لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے۔ ان کی رحلت تو اس صدی کا نصف حصہ گزرنے کے بعد ہوئی مگر وہ اسی دور کے شعرا میں محسوب ہیں جن کا بیان ہورہا ہے۔ فارسی عربی کے فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ انگریزی بھی جانتے تھے اور انھوں نے لکھنؤ کے رنگ شاعری میں بڑی تبدیلی کی۔ وہ کم و بیش ساٹھ سال تک ہر طرح کی نظمیں لکھتے رہے اصول شاعری ہی کے شناسا نہیں بلکہ ان سبھی میں کامل تھے اور مزاج ایسا منکسر تھا کہ ان سے مل کر بھی مستفید ہوتے تھے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ لمبی لمبی نظمیں بھی لکھیں جن میں ہندوستان کے مشہور شہروں کا انتہائی خوبصورت تذکرہ کیا گیا ہے۔ کچھ نظموں میں وہ حالی کے قریب معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ وہ بھی شاعری کے ساتھ ساتھ زندگی میں اصلاح و ترقی چاہتے تھے۔ ان کے کلام کے بہت سے مجموعے ہیں، مگر ان میں سے چند ہی شائع ہوسکے ہیں۔ ایک مثنوی پر

ہندوستان اکیڈمی نے ان کو انعام بھی دیا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری پندرہ برسوں میں انھوں نے عمر خیام کی رباعیوں کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے اور ان پر فاضلانہ اور تحقیقی نوٹ لکھے ہیں: ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ پرانے ہوتے ہوئے بھی وہ جدت سے الگ نہیں تھے اور اسے اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے کچھ شعر یہ ہیں:

دل میں رہ رہ کے کھٹک ہوتی ہے
خلش درد محبت ہوگی
آکر جو نہیں جاتی وہ ہے شب تنہائی
جا کر جو نہیں آتی وہ عمر گریزاں ہے
کل ہم آئینے میں رُخ کی جھریاں دیکھا کیے
کاروانِ عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کیے
زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

مرزا محمد ہادی عزیز (1935-1880) لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں سے تھے۔ وہ بھی ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے یہاں کی شاعری میں جذباتیت کو اہمیت دی اور نئے مسائل لاکر اس کا دائرہ بڑھایا۔ وہ بھی میر و غالب کے عقیدت مند تھے اور انھی کی طرح سنجیدہ خیالات، پرخیال طریقے سے پیش کرتے تھے۔ غزل کے علاوہ وہ قصیدہ بھی بہت اعلیٰ درجے کے لکھتے تھے۔ ان کے قصیدے پیشوایانِ دین کی مدح میں ہوتے تھے۔ عزیز کے تین مجموعے ''گل کدہ''، انجم کدہ اور صحیفۂ ولا، شائع ہو چکے ہیں۔ شبلی، اکبر، شرر اور اقبال، سب نے ان کی غزلوں کی تعریف کی ہے۔ ان کی غزل کے اشعار کا رنگ یہ تھا۔

پہلے آئینہ اک نظر دیکھو
پھر مرا دل، مرا جگر دیکھو
ہائے مجبوریاں محبت کی
چاہیے جو نہ تھا کیا میں نے
بجلی سی ایک سامنے سے آکر نکل گئی
کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

مرزا ذاکر حسین ثاقب (1946-1860) بھی لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے والد کی ملازمت کے سبب سے الہٰ آباد، بھوپال اور آگرہ میں بھی رہے، مگر زیادہ وقت لکھنؤ ہی میں گزرا۔ شعر گوئی میں اس طرح محو ہو جاتے تھے کہ ادھر ادھر کی خبر نہ رہتی تھی۔ زیادہ تر غزلیں کہتے تھے اور میر و غالب کی پیروی کو ہی اپنے لیے فخر کی بات جانتے تھے۔ ان کے کلام میں تھوڑا بہت لکھنؤ کا مصنوعی رنگ بھی ملتا ہے۔ مگر بیشتر جذبات قلب کے اظہار سے ان کی شاعری کا اثر بڑھا ہوا ہے۔ ان کا مجموعہ بھی ''دیوان ثاقب'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے کچھ شعر یہ ہیں:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
تڑپا دیا ہے دل کو شاباش ہم صفیرو!
یوں ہی پھر اک صدا دو ٹوٹا قفس چلا میں
دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

اصغر حسین اصغر گونڈوی (1936-1884) عصرِ حاضر کے شعرا میں اپنی صوفیانہ تخلیقات کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی تعلیم ٹھیک سے نہیں ہوئی تھی، مگر اپنی لگن سے اتنا پڑھ لیا تھا کہ افاضل میں شمار کیے جانے لگے تھے۔ مسلک صوفیہ سے خاص دلچسپی تھی اور اپنے کلام میں مذہبی اور صوفیانہ نظریات پیش کرتے تھے۔ کبھی کبھی نثر بھی لکھتے تھے۔ اُردو کی مشہور مثنوی ''گلزارِ نسیم'' ان کے تنقیدی نوٹس کے ساتھ شائع ہوئی تھی مگر ان کی شاعری میں کیف اور خوبصورتی بڑی مقدار میں ملتی ہے۔ ان کے دو چھوٹے مجموعے نشاط روح اور سرودِ زندگی، شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے کچھ شعر پڑھیے:

جوش جنوں میں چھوٹ گیا آستانِ یار
روتا ہوں منہ پہ دامنِ صحرا لیے ہوئے
میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لیے ہوئے
اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی بارگاہ میں

فانی بدایونی، جن کا نام شوکت علی تھا، اس زمانے کے مشہور شاعروں میں سے ہیں مدت زندگی (1942-1879) تک ہے۔ ایل ایل بی پاس کرکے لکھنؤ آگرہ اور اٹاوہ میں وکالت کرتے رہے۔ پھر حیدرآباد چلے گئے اور وہاں آخری وقت تک مختلف طرح کی ملازمتیں کرتے رہے۔ لڑکپن ہی سے شاعری کی دیوی کے حضور میں سر جھکایا تھا اور بیس سال کی عمر میں ایک مجموعہ تیار کرلیا تھا۔ انھوں نے ملٹن اور دوسرے شعرا کی تخلیقات کے ترجمے بھی کیے تھے، مگر یہ سب سرمایہ کس طرح ضائع ہوگیا اس کے بعد جو کچھ بچا وہ باقیاتِ فانی کے نام سے اور جو کچھ بعد میں لکھا وہ سب ''کلیاتِ فانی'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ فانی نے اپنی زندگی بڑی تکلیف میں گزاری اور کہا جاسکتا ہے کہ اس کیفیت نے ان کو اُردو کا سب سے بڑا قنوطی شاعر بنا دیا۔ ان کا رنگ شاعری میر و غالب سے ملتا جلتا ہے۔ تھوڑا بہت لکھنؤ کا اثر بھی ہے۔ مگر اس میں شک

نہیں کہ وہ صف اول کے شاعر تھے جن کے خیالات میں فلسفیانہ عناصر اور جذبات انگیز حقیقت پسندی دونوں کی کمی نہیں ہے زندگی ان کے لیے ایک مصیبت ہے۔ جس سے انسان مر کے ہی چھوٹ سکتا ہے۔ ان کی شاعری کا رنگ یہ ہے:

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے
میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے
ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلھن بنائے ہوئے
وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم
بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اُٹھا
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

عزیز لکھنوی کے شاگردوں میں جگت موہن لال رواں (1889-1949) بہت مشہور ہیں۔ وہ اناؤ کے رہنے والے تھے اور ایم اے ایل ایل بی تک کی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی تھی۔ اناؤ میں کامیابی سے وکالت بھی کرتے تھے اور شاعری میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ ان کا دیوان ''روح رواں'' اور ایک مثنوی۔ ''نقد رواں'' شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کچھ نامکمل نظمیں بھی چھوڑی ہیں۔ جو ان کے خاندان کے پاس محفوظ ہیں۔ وہ غزلیں اور رباعیاں بڑے دلکش اور موثر طریقے سے لکھتے تھے۔ ان کی نظمیں بھی بڑی گمبھیر اور خیال انگیز ہوتی تھیں دو چار شعر یہ ہیں:

ہنسے بھی روئے بھی لیکن نہ سمجھے
خوشی کیا چیز ہے دنیا میں غم کیا
رواں سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا
وہ رو دیتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا
پیہم دیے وہ رنج کو انساں بنا دیا
منت پذیر ہوں ستم روزگار کا
کسی طرف نظر یاس کرکے رو دنیا
مری زبان میں اس کو فغاں بھی کہتے ہیں

سید مقبول حسین ظریف، لکھنؤ کے ظریفانہ شاعری کے مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل پر اپنے رنگ کی نظمیں لکھیں جن کے مطالعے سے ان کے سماجی شعور کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہنسی ہنسی میں بہت سے کام کی باتیں کہی ہیں جو اصلاح زندگی کے لیے بہت مفید ہو سکتی ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ 'دیوان جی' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری کا رنگ یہ ہے:

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے
منہ پھلا کر تشنہ کا مان محبت کو حضور
شربت دیدار کا پورا گھڑا دینے لگے

چند برسوں کے درمیان ہی اُردو کے تین اچھے شاعر راہی عدم ہوئے دسمبر 1950 میں سیماب اپریل 1951 میں آرزو اور مئی 1951 میں حسرت موہانی سیماب (1880-1950) آگرے کے مشہور شعرا میں سے تھے۔ شروع میں داغ کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ کچھ دن ادھر ادھر نوکری کرتے گزرے مگر بعد میں صرف ادبی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ نثر و نظم ملا کے چھوٹی بڑی کم و بیش تین سو تصنیفات کی ہیں۔ وہ بہت لکھتے تھے اور ہر طرح کی نظم تیز رفتاری سے لکھ سکتے تھے۔ انھوں نے شاعری کا ایک آگرہ اسکول چلانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ان کے مشہور مجموعوں میں کار امروز، کلیم عجم، شعر انقلاب اور سدرۃ المنتہیٰ کے نام لیے جا سکتے ہیں ان کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے۔ مگر زبان اور فن شاعری کے مقتدر عالم ہونے کے سبب سے انھوں نے کبھی کبھی نئی زندگی کے مسائل پر بھی خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ان کے تلامذہ کی تعداد سارے ہندوستان میں ہزاروں تک پہنچتی ہے غزل کے دو چار شعر دیکھیے:

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا
کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
چمن کے سائے کو مدتیں گذریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے
ہر چیز پر بہار ہر اک شے پہ حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں

سید انور حسین آرزو (1872-1951) لکھنؤ کے شعرا میں خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ان کو اپنے زمانے کے بہت بڑے بڑے شعرا میں سمجھا جاتا تھا۔ ان کے والد بھی ایک اچھے شاعر تھے آرزو، جلال کے شاگرد تھے مگر تھوڑے ہی زمانے میں فن شاعری پہ ان کو اتنی قدرت حاصل ہوگئی کہ استاد نے اپنے دوسرے شاگردوں کو انھی کے پاس بھیج دیا۔ جلال کی وفات کے بعد آرزو کو ان کی گدی ملی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ مشکلات و افکار میں گزرا۔ کلکتے اور ممبئی کے تھیٹروں کے لیے ڈرامے اور فلموں کے لیے گانے لکھتے رہے۔ وہ اُردو زبان کے بہت بڑے رمز شناس اور لکھنؤ کی زبان کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان کے کلام کے چار مجموعے، فغان آرزو، جہان آرزو، بیان آرزو اور

سریلی بانسری شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کئی اہم کتابیں جو قواعد اور معانی و بیان سے تعلق رکھتی ہیں چھپ گئی ہیں۔ آرزو نے ہندوستانی زبان میں کچھ ایسی نظمیں لکھی ہیں جن میں فارسی اور عربی کوئی لفظ نہیں آتا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس آسان زبان میں بھی وہ اپنے تاثرات بڑی روانی سے ظاہر کرتے ہیں۔ وہ بھی ان شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے لکھنؤ کے رنگ کو سدھار کر نکھارا۔ مثال کے لیے یہ شعر دیکھیے:

چاہت کا پھل ایسا ہے جیسے جل جائے کھیتی بوئی ہوئی
کیا ہوتا ہے آنسو پونچھنے سے چھپتی نہیں آنکھیں روئی ہوئی
ہے ایک ہی ہونا تو یہ ان بن نہیں اچھی
میرا سا نہ بن تو مجھے اپنا سا بنا دے
تارا ٹوٹتے سب نے دیکھا یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹا ہے
جو دیکھے گا روتے مجھے تم کو ہنستے
مری بات چھوڑو تمھیں کیا ملے گا

ہندوستان کے مشہور سیاسی رہنما اور ممتاز شاعر سید فضل الحسن حسرت موہانی (1875-1951) کی پیدائش موہان ضلع اناؤ میں ہوئی تھی۔ علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری لی اور اسی وقت سے ہندوستان کی تحریک آزادی میں شریک ہوگئے۔ آزادیِ کامل کے پجاری اور غیر معمولی ہمت کے آدمی تھے۔ نہ جانے کتنی بار جیل گئے۔ بیشتر کلام جیل ہی میں لکھا ہے۔ جب کبھی باہر آتے تو ادبی رسالے نکالتے اور اردو شعرا کے منتخب مجموعے شائع کراتے رہے۔ یہ اتنا اہم کام ہے جس کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ حسرت ایک اچھے نقاد بھی تھے اور انھوں نے شعر گوئی کے عیب و ہنر پر کئی کتابیں لکھیں۔ انھیں عصر حاضر کا سب سے بڑا غزل گو مانا گیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ فطرت انسانی کی سہل اور اسی کے ساتھ دلنشیں ہوجانے والی ہمدردی ان سے زیادہ اور کسی کے یہاں نہیں ملے گی۔ ان کی زندگی کی سادگی، سچائی اور وزن سب ان کے کلام میں جگہ پاتی ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان کے یہاں کوئی فلسفیانہ گہرائی اور خیالات کا انوکھاپن نہیں پایا جاتا، مگر وہ غیر معمولی سادگی جو تصنع سے بالکل پاک ہونے کی بدولت دل میں اپنا گھر بنالیتی ہے ان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ محبت کے جذبات اور جوانی کے تجربات کی مصوری ایک عجیب سہولت سے ہوجاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے یہ باتیں سب کے دل کی ہیں۔ اسلوب شاعری کے قدیم و جدید رجحانات ان کے یہاں ایک ہوجاتے ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام تیرہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں شائع ہو چکا ہے اور سب ملا کر بھی ''کلیاتِ حسرت'' کے نام سے چھپا تھا۔ مثال کے لیے یہ شعر دیکھیے:

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کردیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کردیا
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے
پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے
مشتاق دید اور بھی للچا کے رہ گئے
ہم سے ہر چند وہ ظاہر ہیں خفا ہیں لیکن
کوشش پرسشِ حالات چلی جاتی ہے
دل مضطر کی سادگی دیکھو
پھر انھی سے سوال کرتا ہے
لاکھوں میں تیری دید کے مشتاق مگر ہم
ناچار تجھے جی سے بھلانے میں لگے ہیں
ہے مشق سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

یہ سب شاعر اسی عہد کے ہیں مگر ان کی آواز آج کے سریع السیر زندگی کو دیکھتے ہوئے کچھ پرانی معلوم ہوتی ہے۔ اب یہ دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی نظمیں ہر قاری کے دل میں زندگی کے سمجھنے کی خواہش پیدا کردیتی ہیں۔ اپنی تعلیم، گھریلو زندگی اور شعور کے نتیجے میں ان کی تخلیقات میں متاثر کرنے کی صلاحیت ایک سی نہیں ہے۔ کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ اسلوب و شعور دونوں کو دیکھتے ہوئے ان سب کا مطالعہ ایک ساتھ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ مختلف روایات سے فیضان پاتے ہیں۔ مگر ایک تاریخ میں ان کو اسی جگہ پر رکھنا پڑے گا جہاں انھوں نے جنم لیا اور نقادوں کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ کس حد تک اپنے زمانے کی زندگی اور شعور سے متاثر ہو کر تخلیقیں کرتے تھے۔ اگر وہ صرف قدامت پرست ہوں یا مروّجہ طرز کو چھوڑنا چاہتے ہوں تو ان کے اسباب کو بھی دیکھنا ضروری ہوگا۔ مستقبل کا مورخ ان کے بارے میں یہ طے کرے گا کہ وہ کتنی ادبی اہمیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا۔ اس عہد میں شعرا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اچانک پورے ملک کی تخلیقی طاقت بڑھ گئی تھی، بلکہ اس لیے کہ نئے اور پرانے کی کشمکش ایک خاص طرح کے موڑ پر آپہنچی تھی اور ادبی تفکر کا انداز بدل رہا تھا۔ جو شاعر نئے رجحانات کو پوری طرح تسلیم کرنے میں تامل کرتے تھے، وہ بھی تبدیل ہونے والے حالات کا بہت کچھ اثر محسوس کر رہے

تھے۔اس عہد میں بیشتر شعرا ایسے ہیں جنھیں نہ تو پرانا کہا جاسکتا ہے، یہ نہ تو نیا۔ انھوں نے نئے ماحول کو سمجھنے کی سعی کی، مگر ان قدروں کو توڑنے سے معذور رہ گئے جو آزاد، حالی کے زمانے میں بن گئی تھیں۔ ان میں سے کچھ شعرا کا ذکر کیا جاچکا ہے اور کچھ ایسے ہیں، جن کا تذکرہ اس مجمل تاریخ میں بھی ضروری ہے۔ ان میں تلوک چند محروم، یاس یگانہ چنگیزی، جگر مرادآبادی اور اثر لکھنوی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

تلوک چند محروم کی ولادت 1885 کے آس پاس سرحدی صوبے میں ہوئی۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرکے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر سے نظمیں لکھتے ہیں اور بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور ان کا ایک مجموعہ ''گنج معانی'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ نئے پرانے ملے جلے رنگ شعرا میں وہ بڑے محترم سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مذہبی اتحاد اور حب الوطنی کا حصہ بہت ہوتا ہے۔ غزلیں کم کہتے ہیں، مگر جو کچھ کہتے ہیں وہ پرکیف ہوتی ہیں۔ انھوں نے کچھ نظمیں بچوں کے لیے بھی لکھی ہیں۔ محروم کو فن کارانہ مہارت حاصل ہے اور ہر طرح کی نظمیں بڑے آسان اور دلچسپ ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔ فطری، اخلاقی، سماجی، فلسفیانہ نظموں کے علاوہ وہ ان عصری مسائل پر بھی زوردار نظمیں لکھ سکتے تھے۔ اُن کی وفات 1966 میں ہوگئی۔

ان کی کتابوں میں بہار طفلی، کاروانِ وطن، رباعیات محروم، گنج معانی مشہور ہیں۔ ان کے کچھ شعر یہ ہیں:

دامِ غمِ حیات میں الجھا گئی امید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی
اب قفس کو ہی آشیاں کہیے
راحتِ آشیاں ملے نہ ملے
اس کی دھڑکن سے ہیں آثار بغاوت پیدا
بے رخی کرنے پہ آمادہ ہے دل، خیر کرے

اس عہد کے تین شاعر یگانہ، جگر اور اثر کو خاص اہمیت حاصل ہے مگر جن اسباب کا اوپر تذکرہ ہوا ان کو دیکھتے ہوئے ان کو بھی نشاۃ ثانیہ کے شعرا میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے انھوں نے دورِ حاضر کو بھی متاثر کیا ہے۔ مگر زندگی اور ادب کے بارے میں ان کا وہ نقطۂ نظر نہیں ہے جو آج کے نئے لکھنے والوں کا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تخلیقات حیات انسانی کی رنگارنگ تصویروں سے خالی ہیں، بلکہ ان کی نظر گہری اور احساسات کا مطالعہ وسیع ہے اس لیے ان کا اثر کسی نہ کسی شکل میں آج کے اُردو ادب پر پڑ رہا ہے۔

مرزا واحد حسین یگانہ چنگیزی 1884 میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے بڑے بڑے علما اور شعرا سے تعلیم حاصل کی۔ فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ شروع میں یاس کے تخلص سے شاعری کرتے تھے۔ 1908 کے آس پاس لکھنؤ آئے اور یہاں کی ادبی زندگی میں اس طرح شریک ہوئے کہ یہیں کے ہو رہے۔ حلقۂ شاعری میں کسی سے لڑے، کسی کو پچھاڑا، کسی سے دوستی کی اور اس طرح زندگی کے آخر تک شخصیت اور انانیت کو کسی کے سامنے جھکنے نہیں دیا۔ ان کا کلام پڑھ کر انسانی زندگی کی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ آزادی، بانکپن اور پرزوری ان کے خیال کی خصوصیتیں ہیں۔ زبان میں بھی بول چال کی عام لفظوں کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے غالب، اقبال اور جوش کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے اور بہت سے دوسرے شعرا سے بھی وہ مطمئن نہیں ہیں۔ دوسری نثری تصنیفات کے علاوہ ان کی غزلوں کے دیوان، آیات وجدانی اور ''گنجینہ'' کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔ ان کے کچھ شعر یہ ہیں:

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا
خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے
کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے

1956 میں یگانہ کی رحلت کے بعد لکھنؤ کے اہم شاعر رہ گئے مرزا جعفر علی خاں اثر 1885 میں لکھنؤ میں ولادت پائی۔ ان کا خاندان یہاں کا مشہور تعلیم یافتہ اور خوش حال مانا جاتا تھا۔ اثر نے اچھی تعلیم حاصل کی اور 1909 میں اُن کو ڈپٹی کلکٹری مل گئی اور تقریباً 1944 تک ملازمت کا سلسلہ چلتا رہا انھوں نے شاعری لڑکپن سے شروع کردی تھی اور عزیز لکھنوی کے شاگرد ہوگئے تھے۔ وہ انگریزی اور فارسی کے بھی بڑے عالم تھے اور لکھنؤ کی زبان کے بڑے رمز شناس سمجھے جاتے تھے۔ وہ جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے نقاد بھی ہیں اور ان کی تنقیدوں کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اثر کو میر کی شاعری سے انتہائی عقیدت تھی جو ان کے کلام سے صاف طور سے جھلکتی ہے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے بڑے عالموں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے سبھی شاعروں کا اپنی پسند کے مطابق گہرا مطالعہ کیا تھا مگر میر کے کلام کے رموز کو بے نقاب کرنے میں بھی ان کا خاص حصہ ہے۔

اثر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے جن میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ مگر دوسری صنف کے کلام کی مقدار بھی کم نہیں ہے۔ دوسری زبانوں کی اعلیٰ نظموں کا ترجمہ بھی انھوں نے نظم میں کیا ہے۔ ان کا 'بھگوت گیتا' کا ترجمہ بھی بڑی اعلیٰ درجے کی نظموں میں شمار ہوتا ہے اور 'نغمۂ جاوید' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ غزلوں کے تین دیوان، اثرستان، 'بہاراں' اور 'نوبہاراں' بھی چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اور مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور کئی چھپنے والے ہیں۔ اثر کی غزلیں بہت سادہ مگر رنگین ہوتی ہیں۔ ان کی زبان آسان اور شیریں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی گہرے صوفیانہ اور فلسفیانہ خیال بھی پیش کرتے ہیں مگر جذبات محبت کا بیان بڑا پراثر ہوتا ہے۔ نمونے کے لیے ان کے یہ شعر دیکھیے:

بھولنے والے سے کوئی پوچھتا
میں تجھے دل سے بھلاؤں کس طرح
ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے
آنسوؤں میں یہ رنگ تب آیا
جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں
تکیے پھول ترے بستر کے
کچھ روز یہ بھی رنگ رہا انتظار کا
آنکھ اٹھ گئی جدھر بس ادھر دیکھتے رہے
دیکھو نہ آنکھ بھر کے کسی کی طرف کبھی
تم کو خبر نہیں جو تمھاری نظر میں ہے
کچھ دیر فکر عالم بالا کو چھوڑ دیں
اس انجمن کا راز اسی انجمن میں ہے

اثر کو لکھنؤ کی زبان اور اسلوب کے ماہر کی حیثیت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی تنقیدی تخلیقوں میں بھی فن کے اس پہلو کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ تنقیدی تصانیف میں ان کی کتابیں اثر کے مضامین، چھان بین، انیس کی مرثیہ نگاری زیادہ اہم ہیں۔ زبان کی نسبت اُن کی خاص تصنیف 'فرہنگ اثر' ہے جس میں الفاظ کے استعمال، محاوروں وغیرہ سے متعلق اغلاط کا بیان کیا گیا ہے۔ ان کا انتقال 1966 میں ہو گیا۔

جگر مرادآبادی کا شمار اپنی نسل کے مقبول شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا نام علی سکندر تھا اور 1890 میں وہ مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ جگر بچپن ہی سے نظمیں لکھنے لگے تھے۔ کیونکہ ان کے گھر میں کئی شاعر تھے اور لکھنے پڑھنے کی فضا تھی۔ شروع میں 'داغ' کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ مگر جب اصغر گونڈوی کا گہرا اثر پڑا تو انھی کو اپنا کلام دکھانے لگے ان کے تین دیوان، داغ جگر، شعلۂ طور، آتش گل، شائع ہو چکے ہیں وہ خاص طرح کی محبت سے بھرپور نظم لکھتے تھے جن میں کیف اور سرور پایا جاتا ہے۔ کچھ وقت تک شراب ان کی زندگی کا خاص جزو رہی اور اسی کا اثر شاعری پر پڑتا رہا۔ کبھی کبھی انھوں نے صوفیانہ خیالات بھی ظاہر کیے ہیں مگر ان کی شاعری کا وہی حصہ سب سے زیادہ عمدہ سمجھا جاتا ہے جس میں رومانیت میں ڈوبے ہوئے گیت گائے گئے ہیں۔ ان کی شاعری میں جو پرکشش حسن ملتا ہے اس کا راز یہی ہے کہ وہ محبت اور حسن کے پجاری ہیں اور انھیں کا ذکر دلچسپ طریقے سے کرتے رہتے ہیں۔ 1960 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے کچھ شعر یہ ہیں:

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں
کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے
تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں
ہاں مجھی کو خراب ہونا تھا
بتاؤ کیا تمھارے دل پہ گزرے
اگر کوئی تمھی سا بے وفا ہو
آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
لے کے خط ان کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا
ساون کی رین اندھیری تنہائیوں کا عالم
بھولے ہوئے فسانے سب یاد آ رہے ہیں
ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

جن شاعروں کا ذکر نہ ہو سکا ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں ان میں سے اسماعیل میرٹھی، محسن کاکوروی، شوق قدوائی، بے نظیر شاہ، امجد حیدرآبادی، ریاض خیرآبادی مولانا محمد علی جوہر، جلیل مانک پوری، آزاد انصاری، سائل دہلوی، اختر حیدرآبادی، دل شاہ جہاں پوری، نوح ناروی، بے خود دہلوی، وحشت کلکتوی وغیرہ کے بارے میں تھوڑا بہت لکھنا چاہیے تھا۔ مگر ممکن نہ تھا۔ اسی طرح حیات شعراء میں جوش ملسیانی، جگر بریلوی، افسر میرٹھی، منور لکھنوی اور کئی دوسرے شعرا کے بارے میں بھی کچھ نہ لکھا جا سکا مگر ان کے مجموعے اور ان کا کلام مل جاتا ہے اور ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ عہد ہر طرح کے شعور پیش کرتا رہا ہے لیکن جو روایات، حالی، شبلی، اکبر، سرور، چکبست اور اقبال نے پیدا کی تھیں ان کا اتباع کرنے والے آج ان سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور اپنی شاعری سے وہ انقلابی کام لے رہے ہیں جسے وہ اپنا سماجی فرض سمجھتے ہیں۔

□□□

اردو خبرنامہ

"1857 - نشاۃ ثانیہ اور ہندوستانی زبانیں"

سہ روزہ سیمینار

● نئی دہلی، 8 مئی۔ قومی اردو کونسل اور کیندریہ ہندی سنستھان کی طرف سے درج بالا عنوان پر منعقدہ سہ روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ 1857 کی جنگ آزادی کی بنیادی روح اور جذبات کو دوبارہ زندہ کرنا ہی اس کے شہیدوں کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ 1857 کی جنگ آزادی ہندوستان کی طویل تحریکوں کے سفر کا ایک ناقابل فراموش اور قابل فخر پڑاؤ تھا۔ اس سیمینار کی صدارت نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے صدر پروفیسر بپن چندرا نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر معروف ادیب ڈاکٹر سویہ ساچی بھٹا چاریہ اور رام شرن جوشی نے شرکت کی۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ارجن سنگھ نے مزید کہا کہ 857' کی جنگ آزادی کی 150 ویں سالگرہ کے جشن کا گواہ بننا ہر ہندوستانی کے لیے فخر کی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس جنگ آزادی سے قبل بھی ملک کے آدی واسیوں، کسانوں اور دستکاروں نے ملک میں سامراج کے خلاف کافی تحریکیں چلائی تھیں۔ شری ارجن سنگھ نے کہا کہ اس تحریک نے ملک میں قومی سطح کی سوچ اور سیاسی بیداری پیدا کی اور ملک کے شہریوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ یکجہتی کا جو جذبہ اس وقت دیکھنے کو ملا تھا اسے اب اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ مشہور مورخ اور نیشنل بک ٹرسٹ کے چیئرمین پروفیسر وپن چندرا نے کہا کہ اس دور کے لوک گیتوں نے تمام مجاہدین آزادی میں جس انداز سے جوش اور ولولہ پیدا کیا وہ آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ جنگ آزادی کے بارے میں لکھنا آسان نہیں تھا لیکن ادیبوں اور شاعروں نے انگریزوں کے خلاف جو کچھ لکھا وہ آج بھی موجود ہے۔ اردو زبان کی بے باکی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات میں اس وقت جو کچھ چھپا تھا وہ اردو صحافت کی بے باکی کی تابندہ مثال ہے اور مورخوں نے اسے پڑھ کر ہی 1857 کے تعلق سے تاریخ مرتب کی ہے۔ کیندریہ ہندی سنستھان کے رام شرن جوشی نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ سیمینار 1857 کی 150ویں سالگرہ کی آخری کڑی ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ 1857 کی جنگ آزادی کو جو انگریزی غلامی اور زور و ستم کے خلاف عوامی غصے کی علامت تھی اسے نہ صرف ہمیں یاد رکھنا چاہیے بلکہ آنے والی نسلوں تک اس کو منتقل کرنا چاہیے۔

پروفیسر سویا ساچی بھٹا چاریہ نے 1857 کی جنگ آزادی میں ہندوستانی زبانوں کے بارے میں کہا کہ جس طرح اس وقت تمام زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے مذہبی تفریق سے بالاتر ہوکر جنگ آزادی لڑی تھی، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس وقت بھی ہم بلاتفریق مذہب وملت متحد ہوکر ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کریں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ پروگرام ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو مربوط کرنے کی سمت ایک کڑی ہے۔ انھوں نے ان مورخوں پر تنقید کی جو 1857 سے قبل کی جنگ آزادی کو اقتدار کی واپسی کی لڑائی مانتے ہیں۔ انھوں نے اس موقع پر حکومت ہند سے اپیل کی کہ بیگم حضرت محل کا مزار جو کھٹمنڈو (نیپال) میں انتہائی خستہ حالت میں ہے اپنے خرچ سے اس کی مرمت کرائے اور دیکھ بھال کا نظم اپنے ہاتھوں میں لے۔

● 1857 کی جنگ آزادی نے انگریزوں کو چونکا دیا تھا اور وہ ہندو مسلم اتحاد سے سخت پریشان ہی نہیں بلکہ خوف زدہ بھی تھے اسی لیے انھوں نے سب سے زیادہ توجہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے پر دی اور پورے ملک میں "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کو اختیار کیا۔ یہ بات آج ساہتیہ اکادمی کے آڈیٹوریم میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور کیندریہ ہندی سنستھان دلی کیندر کے زیر اہتمام "1857 ۔ نشاۃ الثانیہ اور ہندوستانی زبانیں" کے عنوان سے منعقدہ سہ روزہ سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر اقبال حسین نے کہی۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر اقتدار عالم خاں اور نظامت معروف شاعر مخمور سعیدی نے کی۔ اس موقع پر پروفیسر امتیاز احمد، رشمی چودھری اور اصغر عباس بھی موجود تھے۔

پروفیسر اقبال حسین نے کہا کہ ہندو اور مسلمان دونوں انگریز حکومت میں اپنے مذہبی اور تہذیبی تشخص کو لے کر فکرمند تھے اور وہ مانتے تھے کہ اس حکومت میں ان کی جان و مال اور عزت کچھ بھی محفوظ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ 1857 میں ہندو مسلم اتحاد سیاسی مصلحت نہیں بلکہ صدیوں سے ساتھ رہنے کے سبب وجود میں آئی ایک مشترکہ سوچ تھی۔ اس وقت کے مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر اور دیگر مجاہدین لیڈروں نے بھی اس بات کو بھانپ لیا تھا کہ اب انگریز ہندو اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کریں گے اسی لیے جولائی 1857 میں بہادر شاہ نے ایک پروانہ جاری کرکے مسلمانوں کے لیے گئوکشی پر سختی سے پابندی عائد کردی تھی تاکہ ہندوؤں کے جذبات مجروح نہ ہوں۔ پروفیسر اقبال حسین نے کہا کہ اگر ہم 1857 کی تحریک کے مقصد کو سمجھیں تو فرقہ واریت اور تعصب کو پوری طرح ختم کیا جاسکتا ہے۔

معروف تاریخ داں پروفیسر عرفان حبیب نے کہا کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد کے حالات میں اردو اور ہندی ادب کو الگ الگ کر کے دیکھنا ایک بڑی بھول ہوگی۔ جہاں تک جدید اقدار کی بات ہے تو بہت سی قدریں ہمیں یوروپ سے حاصل ہوئی ہیں۔ ہر چیز میں ہر ملک کا حصہ نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرد و عورت کی برابری یا جمہوریت ہمارے کلچر میں کہیں نہیں تھی۔ یوروپ خاص طور سے فرانس کے انقلاب کا ہم پر کافی اثر پڑا۔ انگریزوں کے آنے کے بعد یہاں دلی کالج اور آگرہ کالج قائم ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی اور اردو ادب نے بہت کچھ یوروپ سے حاصل کیا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری پر بھی شیلے کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ 1857 تک ملک میں ایک قومیت یا وطنیت کا کوئی وجود نہیں تھا۔ انھوں نے راجہ رام موہن رائے کے حوالے سے کہا کہ انھوں نے 1828 میں کہا تھا کہ ہندوستان میں اتنی ذات برادریاں ہیں کہ وہ ایک قوم نہیں بن سکتا۔

معروف ہندی ادیب رمیش راوت نے اپنے مقالے میں کہا کہ 1857 کی جنگ آزادی پر قابو حاصل کر لینے کے بعد انگریزوں میں غرور بھی پیدا ہوا اور مظالم کرنے کا حوصلہ بھی۔ اس کے بعد ایک بے یقینی کی صورت حال پیدا ہوگئی تھی اور حکومت و عوام کے درمیان دوریاں بڑھ گئی تھیں۔ انگریزوں کے ظلم کی وجہ سے ہی قومی تحریک کی راہ ہموار ہوئی۔ عوام کا نظریہ تھا کہ اس حکومت میں نہ تو ان کا مذہب، تہذیب اور ثقافت محفوظ ہے اور نہ ہی صنعت و تجارت اس لیے وہ انگریزوں کو ملک سے کھدیڑ دینا چاہتے تھے۔ 1857 میں ہندو اور مسلمانوں نے مل کر لڑائی لڑی تھی۔ رمیش راوت نے کہا کہ وہ یہ نہیں مانتے کہ 1857 کے سبب ہندی کا 'نو جاگرن' ہوا۔

صدارتی تقریر میں پروفیسر اقتدار عالم خاں نے کہا کہ پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں ایک قومی سیاسی نظریے کی پیش رفت نہ ہوسکی۔ 19 ویں صدی کے آخری نصف میں جو مذہبی اور تہذیبی تحریکیں ہندی علاقوں میں ابھریں ان میں 1857 کے اثرات تلاش کیے جاسکتے ہیں لیکن ان تحریکوں کو نشاۃ الثانیہ کا نام دینا درست نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ 1857 میں فارسی زدہ اردو کے استعمال کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ صرف محل یا شہر کی زبان تھی درست نہیں ہے بلکہ یہ ایک غلط اور متعصبانہ بات ہے۔ اس زبان کو اس وقت پورے شمالی ہند میں سمجھا جاتا تھا۔ پروفیسر اقتدار عالم خاں نے کہا کہ 1857 کے بعد ہی حب الوطنی کا جذبہ ابھر کر آیا۔ انھوں نے ایک مارکسی مورخ کی اس بات پر نکتہ چینی کی کہ انھوں نے بغیر تحقیق کے بخت خاں کو ایک شدت پسند وہابی قرار دے دیا جبکہ یہ سچ نہیں ہے اور بخت خاں ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے بہادر شاہ ظفر کی حمایت سے ہندو مسلم اتحاد کے لیے مسلمانوں پر گئوکشی کرنے پر سخت پابندی لگائی تھی۔

تیسرے اجلاس میں ''1857۔ مذہبی غیر جانبداری اور اردو ہندی کا تعلق'' کے عنوان سے ہوئے مذاکرے میں وشوناتھ ترپاٹھی نے کہا کہ سامراجی طاقتیں مذہب کو اپنا ہتھیار بناتی ہیں۔ رام ولاس شرما نے کہا کہ پچاس سال قبل 1857 کے تعلق سے جو باتیں کہی گئی تھیں اسے اب تاریخ داں تسلیم کرنے لگے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ 1857 کی بغاوت دراصل عام لوگوں کی بغاوت تھی۔ وجے بہادر سنگھ نے اردو اور ہندی کے رشتوں پر تفصیلی روشنی ڈالی جبکہ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اچھی ہندی جاننے کے لیے اردو کا جاننا ضروری ہے اور اچھی اردو جاننے کے لیے اچھی ہندی کا جاننا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی کو تو سیاست نے تقسیم کردیا ورنہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔

آخری دن تین اجلاس ہوئے۔ ان میں ملک بھر سے کئی دانشوروں نے 1857 کی جنگ آزادی کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ دانشوروں کا کہنا تھا کہ 1857 کی لڑائی ہندوستانی عوام کی پہلی عام بغاوت تھی۔ پہلے اجلاس میں تجدید کاری اور لسانی تحفظ کے سوال پر مضامین پڑھے گئے۔ پروفیسر پرشوتم اگروال، راج رام بہادر، ارجن دیوچرن، کشمیری لال ذاکر، غلام نبی خیال اور شیودین سشیل نے 1857 کے حالات و واقعات پر بحث کرتے ہوئے 1857 کے انقلاب سے متعلق مختلف دستاویزات کی اطلاع دی اور کہا کہ اس انقلاب میں دلتوں اور خواتین نے بھی اہم رول ادا کیا تھا۔ دوسرے سیشن میں عالمگیریت اور ہندوستانی زبانوں کے سامنے نیا چیلنج کے موضوع پر صدارت پروفیسر رام شرن جوشی نے کی۔ پروفیسر اروِن کمار چیلنج بست، سید رسول پوم پور اور پروفیسر بھرت سنگھ نے اظہار خیال کیا۔ آخر میں 1857 اور شمالی زبانوں کا میڈیا کے موضوع پر مضامین پڑھے گئے۔ صدارت سندیپ مکھرجی نے کی جبکہ پربھاش جوشی، پروفیسر جوریمل پاریکھ روِیندر ترپاٹھی، پروفیسر شمبھوناتھ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے 1857 کی جنگ آزادی کے دوران میڈیا کے رول سے متعلق واقف کرایا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

محمود شیرانی توسیعی خطبہ

● اودے پور۔ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر ارتضی کریم نے شعبۂ اردو موہن لال سکھاڑیہ یونیورسٹی اودے پور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقد پہلے محمود شیرانی خطبے کے دوران ''اردو فکشن کی تنقید آغاز و ارتقا'' کے موضوع پر توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سترھویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی کی ابتدائی پانچ دہائیوں تک افسانوی ادب کی تنقید کا کوئی واضح رجحان نہیں ملتا لیکن انیسویں صدی کی آخری پانچ دہائیوں میں افسانوی ادب کی تنقید میں ایسے واضح تصورات ملتے ہیں جنھوں نے بیسویں صدی عیسوی میں اردو تنقید کے مختلف دبستانوں کو جنم دیا۔

اس سے قبل استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے شعبے کی انچارج ڈاکٹر زینب بانو

نے شعبے میں ''محمود شیرانی خطبات'' کی سیریز کی منظوری کے لیے قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ توسیعی خطبہ اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ جلسے کی صدارت شہر کے مشہور ادیب اور شاعر جناب عابد ادیب نے کی، مہمان خصوصی ڈاکٹر اے آر. نیازی تھے۔ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کی ایسوسیٹ ڈین پروفیسر انجو کوہلی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان جیسے بھی وجود میں آئی ہو مگر ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ اس کا جنم ہندوستان میں ہوا۔ آغاز میں ناظم جلسہ ڈاکٹر غلام آسی رشیدی استاد شعبۂ اردو نے حافظ محمود شیرانی کی تحقیقی اہمیت کا ذکر کیا اور ان کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا۔

دوران جلسہ بزم ادب کے زیر اہتمام منعقد مقابلۂ مضمون نگاری میں کامیاب ہونے والے طلبہ میں رضوانہ بانو (ایم.اے) کو اول، محمد جبین شیخ (بی.اے) کو دوم اور اختر رسول (بی.اے) کو سوم انعام دیے گئے اور سندوں سے بھی حوصلہ افزائی کی گئی۔ جلسے میں شعبۂ اردو کے اساتذہ، طلبہ وطالبات کے علاوہ دیگر فیکلٹی ممبر وطلبہ، شہر سے شاہد عزیز، عبدالحفیظ حفیظ، حسین اودے پوری، منصور علی، ڈاکٹر تسنیم خانم، محمد افضل، شبنم حسین، میرا گرلس کالج کی طالبات کے علاوہ کثیر تعداد میں شیدایان اردو نے شرکت کی۔ شکریے کی رسم ڈاکٹر شکیلہ رضوی نے ادا کی۔

(ڈاک سے)

جنگ آزادی میں اردو اخبارات کا کردار

● نئی دہلی، ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو اخبارات کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس خیال کا اظہار یہاں ہریانہ کے گورنر اخلاق الرحمان قدوائی نے کیا ہے۔

مسٹر قدوائی نے یہاں ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافیوں نے آزادی کی جو آگ روشن کی تھی وہ آخر تک جلتی رہی اور علما نے جو قربانیاں پیش کیں ان کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔ ''دہلی اور اس کے اطراف میں ہندوستان کی پہلی لڑائی 1857 اردو اخبارات کے تناظر میں'' عنوان کے تحت سیمینار کا اہتمام شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے کیا تھا۔

وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے کہا کہ ہمیں اپنی آزادی کی تاریخ کو بھلانا نہیں چاہیے اور یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو نے ہی انقلاب زندہ باد اور سرفروشی کے انقلابی نعرے دیے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ دہلی حکومت 1857 کی جنگ آزادی کی ایک نمائش منعقد کرے گی اور دہلی کو 1857 سے جوڑنے کے اقدامات کرے گی۔ راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین کے رحمان نے جنگ آزادی میں اردو زبان، صحافت اور شاعری کے کردار پر مفصل روشنی ڈالی۔ مولانا انظر شاہ مسعودی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمات وآثار کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

ڈاکٹر ایس فاروقی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ قومی اردو کونسل، دہلی اردو اکادمی اور آئی سی ایچ آر کے اشتراک سے منعقدہ اس سیمینار میں سراج الدین قریشی، مولانا جنید احمد بنارسی، مولانا عمید الزماں کیرانوی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر مولا بخش کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے کئی اہم نمائندوں نے شرکت کی۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

''جنگ آزادی اور میرٹھ'' ـــ دو روزہ سیمینار

● میرٹھ، پہلی جنگ آزادی کی 150ویں سالگرہ کے موقعے پر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں گذشتہ 20اور 21اپریل کو دو روزہ قومی سیمینار بعنوان ''جنگ آزادی اور میرٹھ'' منعقد کیا گیا جس میں ملک بھر سے مؤرخین و دانشوران نے حصہ لیا۔ سیمینار میں 1857 میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت کے سلسلے میں ایک نئی بات سامنے آئی۔ مؤرخین نے بتایا کہ 1857 کا انقلاب اچانک رونما ہونے والا واقعہ نہ تھا بلکہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کا نتیجہ تھا جس کی تیاریاں برسوں پہلے ہی شروع ہوگئی تھیں۔ پہلے روز سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے میرٹھ کالج میرٹھ کے سابق صدر شعبہ اور معروف مؤرخ ڈاکٹر ایس کے متل نے بتایا کہ کم وقت میں ہی انگریزوں کے خلاف ہندوستانی فوجیوں کی مزاحمت ایک عوامی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔ مہمان خصوصی اور وائس چانسلر پروفیسر ایس پی اوجھا نے آزادی کے متوالوں کو فراموش نہ کیے جانے کی اپیل کی۔ مہمان ذی وقار اور آئی سی ایچ آر نئی دہلی کے ڈپٹی ڈائرکٹر شبیہ احمد نے 1857 کی تحریک کو غدر یا بغاوت کہے جانے پر اعتراض کیا۔ انھوں نے تحریک کی ناکامی کا سبب ذرائع ابلاغ کے فقدان کو بتایا۔

میرٹھ کالج کے ایک اور سابق صدر شعبۂ تاریخ اور مؤرخ ڈاکٹر کے ڈی شرما نے کہا کہ بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں نانا صاحب، بیگم حضرت محل اور رانی جھانسی اور دیگر لوگوں نے اس تحریک کو بین الاقوامی سطح پر پہنچایا۔ مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے سرکار سے ایک کمیشن بنا کر ہندوستانی مؤرخین سے تاریخ کی کتابیں لکھائے جانے کا مطالبہ کیا۔ شعبے کے استاد ڈاکٹر مشتاق صدف نے نظامت کرتے ہوئے کہا کہ جنگ آزادی کے سلسلے میں میرٹھ کے کردار کو نئی نسل تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی کے ای سی ممبر سرور احمد اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیئرمین محمد حسن گھانوی نے بھی خیالات کا اظہار کیا۔ بعد میں مشہور غزل سرا مکیش تیواری نے حب الوطنی پر مبنی غزلیں پیش کیں۔ سیمینار کے دوسرے دن ملک کے مختلف حصوں سے آئے اہل علم حضرات نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے روز سیمینار کو چار اجلاس میں منقسم کیا گیا۔

پہلے اجلاس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر لاری آزاد، ڈاکٹر فاروق بخشی، ڈاکٹر معین الدین جینابڑے اور ڈاکٹر محمد یونس غازی شامل تھے اور مقالہ نگاروں

میں ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی، حیدرآباد (جدوجہد آزادی اور علمائے صادق پور)، ڈاکٹر آزاد وصنا، میرٹھ (گاندھی پریت آندولنوں میں میرٹھ کا یوگ دان)، ڈاکٹر پردیپ جین، مظفر نگر (1857 کی لڑائی میں مظفر نگر کی بھومیکا) اور ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، بنارس (جنگِ آزادی میں محمد علی جوہر کا کردار) نے اپنے مقالے پڑھے۔ نظامت شاداب علیم نے کی۔

دوسرے اجلاس کی مجلسِ صدارت میں ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر کے. ڈی شرما، ڈاکٹر پردیپ جین، سید عاصم علی سبزواری اور نایاب زہرا زیدی شامل تھے۔ مقالہ نگاروں میں ستندر کمار، میرٹھ (1857 کا مہاسنگرام تھا میرٹھ کے تنکالین کوتوال شہید دھن سنگھ گوجر)، شاداب علیم، میرٹھ (1857 کی جنگِ آزادی میں بیگم حضرت محل کا حصہ)، ڈاکٹر شاہد صدیقی، میرٹھ (گمنام مجاہد آزادی شہید شیر علی خاں)، ڈاکٹر ابرار آزاد، خورجہ (میرٹھ کمشنری میں 1857 کی تحریک: علما کی دین)، ڈاکٹر فاروق بخشی۔ کوٹہ راجستھان (مشعلِ آزادی۔ فکری وفنی تجزیہ)۔ ڈاکٹر شہزاد انجم، دہلی (جنگِ آزادی اور مولانا محمد علی جوہر) نے اپنے مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ظفر گلزار نے انجام دیے۔

تیسرے اجلاس کی صدارت اشفاق احمد عارفی، ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی اور بھیاجی غلام فریدالدین صابری نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر معین الدین جینابڑے، ممبئی (جنگِ آزادی اور ناول)، ڈاکٹر ابرار رحمانی، دہلی (جنگِ آزادی اور نیتاجی سبھاش چندر بوس)، ڈاکٹر مولا بخش، دہلی (1857 سے قبل تحریکِ آزادی کا پس منظر تحریک مجاہدین اور شاہ اسماعیل شہید)، محمد اسجد، دیوبند (جنگِ آزادی میں محمد علی جوہر کا کردار) اور اشفاق احمد عارفی، دہلی (جنگِ آزادی اور سرسید) نے اپنے مقالے پڑھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے انجام دیے۔

چوتھے اجلاس کی صدارت مسرور احمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر مولا بخش، غیاث الدین ملک اور سید اطہر الدین نے کی اور مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر کوثر مظہری، دہلی (شہید فرنگ حافظ محمد ضامن اور "مونس مہجوراں")، تسنیم فاطمہ، مواند (1857 کی جنگِ آزادی میں میرٹھ کے اطراف کے مسلمانوں کا حصہ) اور ڈاکٹر کے ڈی شرما نے اظہار خیال کیا۔ نظامت ڈاکٹر افشاں ملک (علی گڑھ) نے کی اور شکریہ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے ادا کیا۔ (ڈاک سے)

"اردو ہندی زبان و ادب اور مشترکہ تہذیب"

● نئی دہلی، 13 اپریل۔ "کوئی دو زبانیں دنیا میں اتنی قریب نہیں ہیں جتنی کہ اردو اور ہندی لیکن افسوس کہ کوئی دو زبانیں دنیا میں اتنی دور نہیں کر دی گئیں جتنی کہ اردو اور ہندی۔" ان خیالات کا اظہار آج پروفیسر گوپی چند نارنگ نے دہلی سرکار کے محکمہ فن وثقافت والسنہ (اردو سیل) کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین میں "اردو، ہندی زبان و ادب اور مشترکہ تہذیب" کے عنوان سے منعقد سہ روزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ اس اجلاس کی صدارت معروف نقاد اور اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے کی جبکہ مہمانانِ ذی وقار میں ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال، پروفیسر گنگا پرساد ول اور شاہد ماہلی شامل تھے۔ اجلاس کی نظامت دہلی سرکار میں اردو آفیسر اشفاق احمد عارفی نے کی۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ زبانوں کا اصل مقصد جوڑنا ہے جدا کرنا نہیں۔ زبانوں کو کسی ایک مذہب سے جوڑنا اور اس کے نام پر سیاست کرنا افسوس ناک ہے۔

جوگندر پال نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں بول چال کی زبانیں ہیں۔ اگر فرق ہے تو محض رسم الخط کا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے جو افسوسناک ہے۔ انھوں نے اس خیال کی تردید کی کہ دونوں زبانوں کا رسم الخط ایک کر دیا جائے۔ لیکن ہمیں چاہیے کہ ان دونوں زبانوں کو اور قریب لانے کی کوشش کریں۔ انھوں نے اردو کو مذہب سے جوڑنے کی سخت مذمت کی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے گنگا پرساد ول نے کہا کہ ہم سب کو مل کر یہ مہم چلانی چاہیے کہ سارک ممالک کی سرکاری زبان "ہندوستانی" ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد 100 کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے قبل اپنی افتتاحی تقریر میں پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ اردو اور ہندی نے تقریباً ساتھ ساتھ ہی جنم لیا ہے اور پرورش پائی ہے، دونوں نے جنگِ آزادی میں نمایاں رول ادا کیا اور دونوں زبانوں نے ایک دوسرے کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی کی ساخت ایک ہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی کے اشتراک سے جس گنگا جمنی تہذیب کا جنم ہوا ہے ہمیں اس تہذیب کا تحفظ کرنا ہوگا۔

4 اجلاس پر مشتمل اس سہ روزہ سیمینار کے تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صادق، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر ابن کنول نے کی جبکہ چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت ڈاکٹر پربھاکر شوتریہ، ڈاکٹر علی جاوید اور دیوندر اسر نے کی۔ نظامت کے فرائض شکیل اختر اور وسیم راشد نے انجام دیے۔ اس موقع پر پروفیسر صادق نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دورِ قدیم سے آج تک مشترکہ تہذیب ہمارے ملک میں زندہ رہی ہے اور یہی ہمارے ملک کی شناخت بھی ہے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ ہمیں اپنی مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ پروفیسر ابن کنول نے ہندی زبان و ادب اور مشترکہ تہذیب پر بھی گفتگو کرانے پر زور دیا۔ چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ زبان کو ہر طرح کے تعصب سے بالاتر رکھا جائے کیونکہ کوئی بھی زبان عوام میں تبھی مقبول ہو سکتی ہے جب وہ ہر طرح کے تعصب سے بالاتر ہو۔ دیوندر اسر نے کہا کہ اردو پاکستان کے کسی خطے کی زبان نہیں لیکن پھر بھی وہاں کی قومی زبان ہے اور جہاں یہ پلی بڑھی اور جوان ہوئی وہیں اسے دوہرا معیار اختیار کیا کرتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ ہندی کے معروف ادیب ڈاکٹر پربھاکر شوتریہ نے کہا کہ کوئی بھی زبان بڑی تب ہی بنتی ہے جب

اسے مختلف حدود سے باہر نکالا جائے۔ اس لیے ہمیں اردو کے فروغ و ترقی کے لیے اپنے دائرے کو وسیع کرنا ہوگا۔ مرغوب حیدر عابدی نے کہا کہ اردو اکادمی اردو کی ترقی کے لیے اپنی جانب سے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ انھوں نے اردو سے محبت کرنے والوں سے بھی اپیل کی کہ وہ بھی اپنے اپنے طور پر اس سمت میں کوشش کریں۔ تیسرے اجلاس میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر مولا نا بخش، ڈاکٹر کوثر مظہری اور شعیب رضا خاں وارثی نے مختلف موضوع پر مقالے پیش کیے جبکہ چوتھے اجلاس میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر شاہینہ تبسم، پروفیسر رضی الدین احمد، دیوندر اسر، فرحت احساس اور ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے مقالات پیش کیے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

غالب اور عہد غالب

● نئی دہلی، 28 اپریل۔ "غالب اور عہدِ غالب" کے موضوع پر دو روزہ قومی سیمینار 28 اور 29 اپریل کو غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی اور انجمن ترقی اردو (جمشید پور) کے زیر اہتمام جمشید پور (جھارکھنڈ) میں منعقد ہوا۔ جس میں ملک کے معروف اردو و فارسی کے دانشوروں نے شرکت کی۔ اردو کے معروف ادیب و دانشور پروفیسر وہاب اشرفی نے سیمینار کی افتتاحی تقریر میں کہا کہ غالب کائنات کے شاعر ہیں لہٰذا انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس سیمینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، جناب شاہد ماہلی، پروفیسر صادق، پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر شریف حسین قاسمی اور پروفیسر ابوذر عثمانی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار میں جہاں ایک طرف ادیبوں، نقادوں اور دانشوروں نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے وہیں عہدِ غالب میں 1857 کی جنگ آزادی میں غالب کے ایسے کلام کی بھی نشاندہی کی گئی جس میں غالب کی حب الوطنی اور انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کا شائبہ ہوتا ہے۔ افتتاحی اجلاس کے آخر میں شام غزل کا پروگرام منعقد کیا گیا۔

سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹ کے ڈین پروفیسر ابوالکلام قاسمی، دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر ریحانہ خاتون، پروفیسر لطف الرحمٰن اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے اپنے مقالات پیش کیے۔ ملک کے مختلف مقامات اور یونیورسٹیوں سے آئے دانشوروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار کے دوسرے اجلاس میں پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر منظر شہاب، پروفیسر ابوذر عثمانی اور پروفیسر علی احمد فاطمی نے مقالات پیش کیے۔ مقالات کے بعد سوالات اور بحث و مباحثے کا سیشن ہوا۔ جس میں مقالہ نگاروں کے علاوہ سامعین حضرات نے بھی دلچسپی لی اور تاثرات پیش کیے۔ اس سیمینار کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ سیمینار ایسے وقت میں منعقد ہوا جبکہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی 150 ویں سالگرہ بھی منائی جا رہی ہے۔

سیمینار کے دوسرے دن اختتامی اجلاس کے بعد کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت کریم سٹی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمود زکریا نے کی۔ شعرا حضرات میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی، جناب شیدا اگھنی، جناب طیب وارثی، جناب اسلم بدر، جناب محشر جیبی، جناب جوگیندر سنگھ 'دیپ'، جناب شیش ناتھ شرد، جناب یوسف دانش، جناب نظیر احمد نظیر اور شاعرات میں محترمہ رضوانہ ارم وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ "غالب اور عہد غالب" پر منعقد ہونے والا یہ دو روزہ قومی سیمینار کامیابی کے ساتھ 29 اپریل 2007 بوقت رات 10 بجے اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

تعلیمی بیداری میں مدارس عربیہ کی اہمیت

● کانپور، مینجرس ایسوسی ایشن مدارس عربیہ اتر پردیش کے زیر اہتمام مرچنٹس چیمبر ہال سول لائن کانپور میں بعنوان "دورِ حاضر میں مسلمانوں کی تعلیمی بیداری میں مدارس عربیہ کی اہمیت و افادیت" کے موضوع پر ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس کا آغاز قاری عبدالحیٔ کی تلاوت قرآن مجید اور مولانا شکیل کے ذریعے کیے گئے ترجمے کے ساتھ ہوا۔ جناب محمد علی کاظمی ایڈوکیٹ جنرل حکومت یو پی کی زیر صدارت منعقد ہونے والی اس تعلیمی کانفرنس میں خصوصی مقررین کی حیثیت سے پروفیسر اختر الواسع (دہلی) اور پروفیسر اشتیاق احمد کاظمی (علی گڑھ) نے مہمانان اعزازی کی حیثیت سے جناب راشد حسین نادری چیئرمین یو.ڈی.اے اور ڈاکٹر نعیم حامد رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لاء نے شرکت کی۔

شیعہ عالم دین مولانا علی عباس نجفی نے اپنے ابتدائی کلمات میں فرمایا کہ علم علم کے لیے حاصل کیا جاتا ہے، معاش کے لیے نہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے فرمایا کہ علمائے کرام کی طرف سے مدارس و مکاتب قائم کرنے سے تعلیمی ماحول بہتر ہوا ہے۔ علمائے کرام نے علم کا چراغ روشن کر کے تعلیم کا نور پھیلانے کے لیے ناقابل فراموش خدمات اور قربانیاں انجام دی ہیں۔

علی گڑھ سے تشریف لائے پروفیسر اشتیاق احمد کاظمی نے فرمایا کہ دنیا میں سب سے بڑا تعلیمی انقلاب اسلام کے توسط سے ہی آیا ہے۔ تعلیمی نظام پر عمل کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے یہ بات قابل تعریف ہے کہ ہمارے مدارس حکومت کی تعلیمی ذمہ داری کو اپنے طور پر نبھا رہے ہیں اور یہ عظیم کارنامہ وہ صرف اللہ واسطے انجام دے رہے ہیں۔

جناب محمد علی کاظمی نے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ قرآن سرچشمۂ تعلیم و حیات ہے تو اس کو پڑھانے والے مدارس تعلیم کا خزینہ اور علم کی روشنی کا منبع ہیں۔ مدارس کے تعلق سے سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ عصری علم کو مدارس میں جگہ ملنی چاہیے۔ خان احمد فاروقی کی زیر نظامت منعقد ہونے والی اس تعلیمی کانفرنس کا افتتاح جناب راشد حسین نادری چیئرمین یو.ڈی.اے کے ہاتھوں ہوا قائم مقام صدر ایسوسی ایشن ماسٹر لطیف عباس نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا، جنرل سکریٹری ڈاکٹر

آراے خاں نے تجاویز پیش کیں جنھیں اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا۔ آخر میں تمام شرکا کا شکریہ جناب شمیم ہاشمی سکریٹری ایسوسی ایشن نے ادا کیا۔ مذکورہ پروگرام دن میں ہوا اسی روز رات میں ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام کل ہند مشاعرہ ہوا جس میں خاصی تعداد میں بیرونی شعرا نے حصہ لیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

امیر خسرو دہلوی کے ہندوی کلام پر خطبہ

● نئی دہلی، 6 اپریل۔ ایوان غالب میں نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کی طرف سے امیر خسرو پر ایک خصوصی خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت جناب شفیعی شکیب صاحب کلچرل کاؤنسلر اسلامی جمہوری ایران، نئی دہلی نے فرمائی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ صدر ساہتیہ اکادمی نے ''امیر خسرو دہلوی کا ہندوی کلام'' پر خطبہ پیش کیا۔

جلسے کے آغاز میں پروفیسر شریف حسین قاسمی، سکریٹری نیشنل امیر خسرو سوسائٹی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس سوسائٹی کا مختصر تعارف پیش کیا اور فارسی زبان وادب کی تاریخ میں امیر خسرو کے اعلیٰ مقام کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ خسرو پر حالانکہ بہت تحقیقی کام انجام دیا جاچکا ہے جس کا آغاز وحید مرزا کی خسرو کی زندگی اور علمی وادبی کارناموں پر انگریزی اور اردو کتابوں کی اشاعت سے ہوتا ہے، تاہم ان کے کلام کے بعض پہلو ابھی تشنۂ تحقیق و بیان ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں خسرو کے ان قصائد کا خصوصی ذکر کیا جن میں خسرو نے دنیا اور اس سے وابستگی کی وقتی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ خسرو سات بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے لیکن ان کے اس نوعیت کے قصائد خود ان بادشاہوں کو دنیا کی بے ثباتی، یہاں کی رونق اور چمک دمک کا بے وقعت ہونا، اس سے وابستگی کا مہمل تصور وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کے کلام کا یہ پہلو ابھی مکمل طور پر واضح نہیں ہوسکا ہے اور اس پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر خلیق انجم نے مہمانوں کا استقبال کیا اور دونوں مہمانوں جناب شفیعی شکیب اور پروفیسر نارنگ کا گلدستوں سے استقبال کیا۔

پروفیسر نارنگ نے امیر خسرو کے ہندوی کلام سے مفصل اور تحقیقی بحث کی۔ یہ کلام جن قدیم مآخذ میں درج ہے ان کا ذکر کیا اور خاص طور پر ہندوستان سے باہر کے کتب خانوں میں خسرو کے جستہ جستہ ہندوی کلام کے نمونوں کے مآخذ کی وضاحت کی۔ انھوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ ہمیں جب تک قطعی طور پر یہ معلوم نہ ہوجائے کہ خسرو سے منسوب ہندوی کلام کس کا ہے، اس وقت تک اس کا خسرو سے انتساب نہ صرف درست ہے بلکہ یقینی ہے۔ ہم خسرو کے ہندوی کلام کو کسی بھی طرح نظرانداز نہیں کرسکتے۔ یہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور اس پر کام کرنے والوں نے اس کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہمیں خسرو کے ہندوی کلام سے متعلق اپنی تحقیق جاری رکھنی چاہیے اور وہ وقت دور نہیں جب ہمیں کوئی نہ کوئی ایسا قدیم مآخذ ضرور ملے گا جس سے ہندوی کلام کا خسرو کے ساتھ انتساب حتمی صورت اختیار کرے گا۔

جلسے کے صدر جناب شفیعی شکیب نے خسرو کے کلام کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا اور فارسی ادب خاص طور پر فارسی شاعری میں خسرو کے نہایت بلند مقام کی تصدیق کی اور اس کی وجوہات پر بھی روشنی ڈالی۔ آپ نے مزید فرمایا کہ خسرو اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے خصوصی تعلقات پر بھی روشنی ڈالی جانی چاہیے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا پر اگر نیشنل امیر خسرو سوسائٹی سیمینار منعقد کرے گی تو خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی پورا تعاون کرے گا۔

اس خطبے کے بعد موسیقی کا پروگرام منعقد ہوا جس میں دہلی کے معروف گانے والے استاد ضمیر احمد خاں نے حضرت امیر خسرو کا ہندوی کلام پیش کیا۔ اس جلسے میں وحید مرزا صاحب کی امیر خسرو پر کتاب اور امیر خسرو سے متعلق سی ڈی اور کیسٹ کی جسے ڈاکٹر ظ۔ انصاری مرحوم نے مرتب کیا تھا، رونمائی بھی عمل میں آئی۔
(ڈاک سے)

دنیا کی تاریخ وترقی میں مسلمانوں کا اہم کردار

● نئی دہلی، 8 مئی۔ ترقی کرنے کے لیے ماضی کی جانب نہیں بلکہ مستقبل کی جانب دیکھنا ضروری ہے اس لیے مسلمان اپنے ماضی سے باہر نکلتے ہوئے مستقبل کی جانب توجہ دیں تاکہ وہ نئے دور کے ساتھ ہم آہنگ ہوں اور ترقی کے منازل طے کرسکیں۔ ان خیالات کا اظہار آج انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے زیر اہتمام استقبالیہ تقریب کے دوران مرکزی وزیر برائے شہری ترقی ایس جے پال ریڈی نے کیا۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے آڈیٹوریم میں منعقد تقریب کے دوران جے پال ریڈی نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج مسلمان بے حد پسماندہ ہیں، حد تو یہ ہے کہ وہ دلتوں اور قبائلیوں سے بھی پیچھے ہیں۔ سچر کمیٹی نے اسی سچائی کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری ذاتی رائے ہے کہ مسلمانوں کو تعلیمی، سماجی اور اقتصادی پسماندگی سے باہر نکالنے کے لیے خصوصی اقدامات کی ضرورت ہے۔ ماڈرن یوروپی فلاسفی پر مسلم فلاسفروں کا بہت زیادہ اثر رہا ہے اور دنیا کی تاریخ میں مسلمانوں کا بہت اہم رول ہے جسے کسی صورت نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کم کرکے آنکا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوروپ کے ادب میں جو اضافہ ہوا ہے اس میں بھی عرب لٹریچر کا بہت بڑا ہاتھ ہے جو لیٹن اور گریک میں ترجمہ کیا گیا۔ دہشت گردی کے تعلق سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دہشت گردی سے کسی بھی مسئلے کو حل نہیں کیا جاسکتا لیکن میں یہ مانتا ہوں کہ ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ دہشت گردی کیوں پیدا ہوتی ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ ماضی میں جاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ 20 ویں صدی میں اگر کسی کے ساتھ سب سے زیادہ ناانصافی اور ظلم ہوا ہے وہ فلسطینی ہیں۔ انھوں نے بہت صاف گوئی سے کہا کہ یہودیوں نے برطانیہ کی مدد سے دہشت گردی شروع کی جس کے نتیجے میں عربوں کی جانب سے مزاحمت شروع ہوئی۔ انھوں نے کہا

کہ آزادی سے قبل ہمارے بابائے قوم مہاتما گاندھی نے یہودی رہنماؤں کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ مزاحمت کرنے والے عربوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھیں گے۔ جے پال ریڈی نے اس موقع پر کہا کہ ہندوستان مسلمانوں کے آنے سے قبل بھی ایک سیکولر ملک تھا۔ انھوں نے کہا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے آنے سے قبل یہاں صرف ہندو ازم ہی تھا وہ غلط ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں اسلام کی آمد سے قبل ایک ہزار سال تک بودھوں نے حکومت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں مسلمانوں کا نہیں سچائی کا حامی ہوں اور تاریخ کو صحیح طریقے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج ہم 1857 کی جنگ آزادی کی 150ویں سالگرہ منا رہے ہیں جس میں ہندو اور مسلمان دونوں نے ہی مل کر جنگ لڑی تھی اور بہادر شاہ ظفر اس وقت کے سپریم کمانڈر تھے۔ اس سے قبل انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے ملک کے لیے ایس جے پال ریڈی کی خدمات کی ستائش کی اور امید ظاہر کی کہ پورے ملک کے لوگوں بالخصوص دہلی والوں کو ان سے جو امیدیں ہیں وہ اس پر کھرے اتریں گے۔ اس تقریب کی نظامت ایڈووکیٹ وصی احمد نعمانی نے کی۔ ڈاکٹر نفیس احمد عباسی، موسیٰ رضا، صفدر حسن خاں اور ایم اے حق بھی موجود تھے۔ دیگر اہم شرکا میں سابق مرکزی وزیر اور ممبر پارلیمنٹ سی کے جعفر شریف، حاجی انیس درانی، مشتاق احمد ایڈووکیٹ، منصور احمد عثمانی، ڈاکٹر پرویز میاں، کمال فاروقی، مسعود ہاشمی، مظفر بیگ، احمد رضا، ملک ذہین، صغیر زیدی، ایچ آر خاں سہیل کے علاوہ متعدد سرکاری اور سماجی شخصیات موجود تھیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ادبی تنظیموں کو اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کا مشورہ

● الٰہ آباد، 11 مئی۔ ادبی و لسانی قومی تنظیم اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے شمالی ہند (بہار، اتر پردیش اور دہلی) کی اردو ادبی تنظیموں، شاعروں، ادیبوں، مراسلہ نگاروں اور اردو کے اساتذہ نیز اردو داں عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے بیانات، مراسلات اور مطالبات میں اردو زبان کو صرف اردو کے نام سے موسوم نہ کریں بلکہ 'سرکاری زبان اردو' یعنی آفیشیل لنگویج اردو، کے 'لفظ' کا استعمال کریں۔ سرکاری زبان اردو کہنے اور سننے میں ایک وزن کا احساس ہوتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اردو شمالی ہند کی تین ریاستوں (بہار، اتر پردیش اور دہلی) کے ایوانوں سے علاقائی زبان تسلیم ہو کر دوسری سرکاری زبان بن چکی ہے۔

اردو کو درجہ آٹھ تک لازمی کرنے کا مطالبہ کرنے والی تنظیموں کے بیان پڑھنے کے بعد مذکورہ مشورہ دیتے ہوئے اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ہماری تنظیم کے ایک عہدیدار نے عدالت عالیہ میں مقدمہ نمبر 44391/98 داخل کر کے مطالبہ کیا تھا کہ سرکاری زبان اردو کے قانون کا نفاذ کرایا جائے اور سرکاری زبان ہندی کی طرح سرکاری زبان اردو کی تعلیم درجہ انٹرمیڈیٹ تک لازمی کی جائے جس پر عدالت نے 24-8-2004 کو فیصلہ دیا تھا کہ "قانون اردو کے نفاذ" کے لیے تمام موثر اقدامات اٹھائے جائیں۔ چنانچہ ملائم سنگھ نے دسمبر 2004 میں اعلان کیا تھا کہ اتر پردیش میں ہندی کے علاوہ ایک اور علاقائی زبان کی تعلیم درجہ آٹھ تک لازمی کی جائے گی مگر وہ زبان کون سی ہوگی یہ اعلان نہیں کیا تھا۔ تنظیم کو یقین تھا کہ وہ زبان اردو ہی ہوگی لیکن ملائم سنگھ نے آج تک دوسری سرکاری زبان اردو کی تعلیم کو لازمی نہیں کیا اور نہ ہی سرکاری ملازمت میں آنے کے لیے اردو کے علم کو لازمی کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

پروفیسر عبدالمغنی کی شخصیت و خدمات پر سیمینار

● حاجی پور، 23 اپریل۔ انجمن ترقی اردو ویشالی کے زیر اہتمام گذشتہ 22 اپریل کو "ساجدہ منزل" حاجی پور میں اردو کے مایہ ناز نقاد، ماہر اقبالیات اور تحریک اردو کے قافلہ سالار پروفیسر عبدالمغنی کی شخصیت اور خدمات کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر نجم الہدیٰ سابق صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی مظفر پور نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صدر انجمن ترقی اردو ویشالی نے انجام دیے۔ سیمینار میں پروفیسر عبدالمغنی کی ہشت پہلو شخصیت پر ڈاکٹر نجم الہدیٰ، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر نجیب اختر، انوار الحسن وسطوی اور ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق نے اپنے مقالے پڑھے۔ اس موقع پر جناب کمال اظفر صدر انڈین نیشنلسٹ یونین، ڈاکٹر اسلم جاوداں ناظم اعلیٰ اردو کونسل ہند اور معروف انشائیہ نگار جناب تمنا مظفر پوری نے بھی پروفیسر عبدالمغنی سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ پروفیسر نجم الہدیٰ نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ بہار میں اردو زبان کے قائدین میں عبدالمغنی صاحب کا نام یقیناً تابندہ رہے گا اور ناموافق حالات کی گرد اسے کبھی دھندلا نہیں کر سکے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی کی رحلت کے ساتھ ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا ہے انجمن کے سرپرست جناب محمد ابوصالح کے اظہار تشکر پر سیمینار اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

کرتار سنگھ دگل کو ساہتیہ اکادمی فیلوشپ

● نئی دہلی، 5 مئی، آج یہاں پنجابی، ہندی اردو اور انگریزی کے ممتاز ادیب و شاعر، نقاد و فکشن نگار کرتار سنگھ دگل کو 'ساہتیہ اکادمی فیلوشپ' سے سرفراز کیا گیا۔ ساہتیہ اکادمی آڈیٹوریم میں منعقدہ تقریب میں صدر ساہتیہ اکادمی پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انھیں ساہتیہ اکادمی کے سب سے اعلیٰ اعزاز سے نوازا اور ان کی خدمت میں شال اور میمنٹو پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی مختلف زبانوں سے وابستہ ادیبوں کی ایک کہکشاں ہے۔ انھوں نے کرتار سنگھ دگل کو بھارتیہ بھاشا کی تین مورتی قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی تخلیقات سے سماج کی مثبت قدروں کو اجاگر کیا ہے اور ایسے ملے جلے سماج کو پروان چڑھایا ہے جس میں پورا ہندوستان نظر آتا ہے۔

اس موقع پر موجود سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے کرتار سنگھ دگل کے ساتھ اپنے رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جتنی تعداد میں افسانے اور دیگر نگارشات لکھی ہیں، ہندوستان میں کسی نے نہیں لکھیں۔ انھوں نے کہا کہ دگل نے ادب کو ایک نئی سمت و رفتار دی ہے جس کی جتنی سراہنا کی جائے کم ہے۔ انھوں نے گرو گرنتھ صاحب انگریزی ترجمے کے کام کو دگل کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا۔

ممتاز اسکالر اور سابق ممبر پارلیمنٹ ایل ایم سنگھوی نے کہا کہ کرتار سنگھ دگل کی گرانقدر ادبی خدمات کے پیش نظر نوبل انعام کے لیے ان کے نام کی سفارش کی جانی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کہے کو کہنے کے فن سے کرتار سنگھ دگل پوری طرح واقف ہیں اسی لیے ان کا ادب سماج کو آئینہ دکھاتا ہے۔

اس پرمسرت تقریب میں وزیر اعظم ہند جناب من موہن سنگھ کی اہلیہ گرشرن کور نے دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ کرتار سنگھ دگل نے اپنی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے لیکن بڑی خوش اسلوبی سے ان کے ساتھ نباہ کی اور ایک اچھی زندگی گزارنے میں ان کی اہلیہ عائشہ کا جو کردار رہا ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے کہا کہ کرتار سنگھ دگل کے قلم کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔

اس موقع پر کرتار سنگھ دگل کی چار کتابوں کا اجرا بدست اندر کمار گجرال، ایل ایم سنگھوی اور محترمہ گرشرن کور عمل میں آیا۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری اے کرشنا مورتی نے یہ بتایا کہ پنجابی میں کرتار سنگھ دگل کے 28 افسانوی مجموعے، 13 ناول، 15 ڈراموں کے مجموعے، 8 شعری مجموعے، دو خود نوشتیں، 9 تنقیدی تصانیف اور سات دیگر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہندی میں 15 افسانوی مجموعے، 12 ناول، 6 ڈراموں کے مجموعے اور 3 یک بابی ڈراموں کے مجموعے اب تک چھپ چکے ہیں۔ اردو میں 3 افسانوی مجموعے، ڈراموں کے 2 مجموعے اور 4 ناول منظر عام پر آچکے ہیں جبکہ انگریزی میں 8 افسانوی مجموعے، 2 ناول، ایک سوانح عمری اور تقریباً 41 سے زائد مرتب کردہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس جلسے میں ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر جناب شاہد ملک نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

آخر میں اس موقع پر ایک محفل مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں کرنجیت سنگھ، ستندر سنگھ نور اور مدھومیت نے کرتار سنگھ دگل کی مجموعی ادبی خدمات کا محاکمہ کیا نیز ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام کرتار سنگھ دگل کی زندگی اور ادبی خدمات پر گل بہار سنگھ کی ہدایت میں بنی ڈاکومنٹری بھی دکھائی گئی۔ اس تقریب میں پنجابی، ہندی، اردو اور انگریزی کی سرکردہ شخصیات بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ (ڈاک سے)

جہاں گیر وارثی ''گلوری آف انڈیا ایوارڈ'' کے لیے منتخب

نئی دہلی، 9 مئی امریکہ کے سینٹ لوئس میں واشنگٹن یونیورسٹی کے ایک استاد پروفیسر محمد جہاں گیر وارثی کو ''گلوری آف انڈیا ایوارڈ'' کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ گلوری ایوارڈ دینے والی سوسائٹی کے آفس سکریٹری گرمیت سنگھ نے اس سلسلے میں ڈاکٹر وارثی کو ای میل کے ذریعے اطلاع دی ہے، جس کے مطابق لندن کے کراؤن پلازہ میں 21 جولائی 2007 کو جلسہ تقسیم انعامات منعقد کیا جائے گا۔ اس تقریب میں، جس کا نام ''دوستی استقبالیہ'' رکھا گیا ہے، پروفیسر ایم جے وارثی کو گلوری آف انڈیا ایوارڈ اور ایک توصیفی سند پیش کی جائے گی۔ گرمیت سنگھ نے اپنے خط میں پروفیسر وارثی کو جلسہ تقسیم انعامات میں شرکت کے لیے طے شدہ تاریخ پر لندن پہنچنے کی اطلاع دی۔ پروفیسر ایم جے وارثی بہار کے مردم خیز علاقہ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہے۔ لسانیات کے ماہر ہیں۔ دو کتابیں سپرد قلم کی ہیں اور واشنگٹن یونیورسٹی ان سینٹ لوئس میں پڑھاتے ہیں۔

(انڈیا ٹوڈے، نئی دہلی)

کمال فاروقی دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین مقرر

● نئی دہلی، 12 مئی۔ معروف سماجی کارکن اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کمال فاروقی کو دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کا چیئرمین مقرر کیا گیا ہے۔ سہ رکنی کمیشن میں چیئرمین کے علاوہ مسٹر آرنلڈ جیمس اور بھوپندر سنگھ کو ممبر بنایا گیا ہے۔ واضح ہو کہ دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین پروفیسر ابوبکر کی تین سالہ میعاد آٹھ ماہ قبل ہی مکمل ہو گئی تھی اور کمیشن کی تشکیل نو نہ کیے جانے پر اقلیتی فرقوں میں سرکار کے تئیں ناراضگی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔

اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے مسائل کو حل کرانے کے لیے ہمیشہ متحرک رہنے والے کمال فاروقی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی ایگزیکیٹو کونسل کے رکن ہونے کے ساتھ ساتھ سینٹرل بنک آف انڈیا کے ڈائرکٹر بھی ہیں۔

انفارمیشن ٹکنالوجی اور بنکنگ کے ماہر کمال فاروقی نے مسلمانوں کے مسائل کو ہر سطح پر اٹھایا ہے۔ ان کے دہلی اقلیتی کمیشن کا چیئرمین بن جانے کے بعد یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس ادارے کو اور زیادہ فعال بناتے ہوئے اس کی کارکردگی میں مزید بہتری لانے کی کوشش کریں گے۔ دیگر اقلیتی فرقوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مسائل حل کرانے کے لیے بھی سرگرم کردار ادا کریں گے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مختصرات

● نئی دہلی، 11 مئی۔ سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور موجودہ چانسلر جامعہ ہمدرد نے اپنی گرانقدر کتابوں کا ذخیرہ جو تقریباً ساڑھے تین ہزار کتابوں پر مشتمل ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو نذر کر دیا ہے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لائبریرین شکیل احمد نے چودھری احرار الحق کے ذریعے ان کتابوں کو آج تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی سے علی گڑھ منتقل کر دیا۔ سید حامد کا اس ذخیرے کو اے ایم یو کے لیے وقف کرنا ان کی اس والہانہ محبت کا مظہر

ہے جو کہ ان کو اپنی مادرِ علمی سے ہے۔ ان کتابوں میں فارسی، انگریزی، عربی، اردو اور ہندی کی کتابیں شامل ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● کولکاتا، 15 اپریل۔ ہولی برائٹ فاؤنڈیشن، مٹیابرج، کلکتہ 24 کی جانب سے فروغِ اردو کے لیے انعامات دینے کی تقریب مورخہ 15 اپریل 2007 بروز اتوار بمقام شاہی امام باڑہ منعقد ہوئی جس کی صدارت مشہور شاعر اور سماجی کارکن شاہد حسین شاہد نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے معروف ادیب ڈاکٹر سید غلام امام حیدر موجود تھے۔ دوسرے مہمانوں میں جناب صابر علی اور جناب زین العابدین تھے۔ نقابت سہ ماہی ''کاف نون'' کلکتہ کے مدیر انور حسین انجم نے کی۔ مہمانوں کا استقبال پھولوں کے ہار سے کیا گیا۔ سب سے پہلے فاؤنڈیشن کے سکریٹری ڈاکٹر رہبر علی نے اس پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ مہمانوں نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرنا بے حد ضروری ہے تاکہ زبان و ادب کے خزانے میں اضافہ ہوتا رہے۔ انعام پانے والے حضرات کے تعلق سے شمیم اشرف، جمشید خاں (ایڈوکیٹ)، محمد شہواز اور محمد جابر علی (ایڈوکیٹ) نے مختصر مضامین پڑھے۔ اس کے بعد تقسیم انعامات کی باری آئی۔ 2006 کی کل بنگال پیمانے پر بہترین کتاب (شاعری) کا انعام ممتاز انور کی کتاب ''لکڑی کا گھوڑا'' کو دیا گیا جبکہ بہترین کتاب (نثر) کا انعام ابوالکلام رحمانی کی کتاب ''تعارف اور تجزیہ'' کو ملا۔ نواب واجد علی شاہ ایوارڈ 2006 نوجوان ناقد، شاعر اور صحافی ڈاکٹر محمد زاہد کو دیا گیا جبکہ ''امتیاز وحشت ایوارڈ 2006'' کلکتہ یونیورسٹی کے استاد شعبۂ اردو پروفیسر یوسف تقی صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ صدر کے کلمات کے بعد فاؤنڈیشن کے رکن ڈاکٹر محمد تسیم نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● بھیونڈی، 22 اپریل۔ بروز اتوار، ''بزمِ علم و ادب'' بھیونڈی کی جانب سے طلبہ و طالبات کی رہنمائی کے لیے ایک مفید و معلوماتی کیریئر گائیڈنس پروگرام ''راہیں بند نہیں'' بمقام جی ایم مومن ویمنز کالج آڈیٹوریم منعقد کیا گیا۔ دسویں اور بارہویں کے بعد مختلف کورسیس کی جانکاری اور صحیح کیریئر کے انتخاب کے سلسلے میں طلبہ کی رہنمائی کے لیے عروس البلاد سے کاظم ملک صاحب اور جناب عامر انصاری صاحب بطور مقررین خصوصی مدعو تھے۔

پروگرام دو سیشن میں منقسم تھا۔ پہلا سیشن صرف آرٹس کی طالبات کے لیے اور دوسرا سیشن کامرس اور سائنس کے طلبہ و طالبات کے لیے مخصوص تھا۔ ہر دو سیشن میں مقررین موصوف نے طلبہ و طالبات کو اپنے اپنے شعبوں سے متعلق مختلف کورسیس کی معلومات بہم پہنچائیں اور ان پر سیر حاصل گفتگو بھی کی۔ مقررین کے خطاب کا بنیادی پہلو یہی تھا کہ کامیابی بغیر جدوجہد کے ممکن نہیں اور یہ کہ غلط راہوں کے انتخاب سے منزلیں دور ہو جاتی ہیں اس لیے طلبہ اپنے بہتر مستقبل اور شاندار کیریئر کے لیے موزوں و مناسب کورسیس ہی کا انتخاب کریں۔ وقفۂ سوالات کے دوران طلبہ نے مختلف کورسیس کی مزید جانکاری کے لیے سوالات کیے جن کے اطمینان بخش جوابات مقررین موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں دیے۔

پروگرام کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ مسندِ صدارت پر جناب فیضان احمد صاحب (ہیڈ ماسٹر، رئیس ہائی اسکول و جونیئر کالج) جلوہ افروز ہوئے۔ جناب ڈاکٹر مصدق چپل صاحب (اعزازی جنرل سکریٹری، کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی)، انجینئر روش دھورو صاحب (چیئرمین اقرا ہاؤس)، جناب شفیع مقری صاحب (چیئرمین رئیس ہائی اسکول)، جناب جنید فقیہ صاحب (ہیڈ ماسٹر، رفیع الدین فقیہ بوائز ہائی اسکول) اور جناب قطب الدین شاہد (معاون مدیر، روزنامہ انقلاب) نے بحیثیت مہمانانِ خصوصی شریک ہوکر پروگرام کو رونق بخشی۔ مہمانانِ موصوف کے طلبہ و طالبات سے خطاب کا لب لباب یہ تھا کہ طلبہ محنت سے پڑھائی کریں، اچھی صلاحیتوں اور خوبیوں کے حامل طلبہ و طالبات کا ہر ادارہ بڑھ کر استقبال کرتا ہے اور یہ کہ کامیابی کے لیے کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ بغیر کوشش اور مستقل جدوجہد کے کامیابی کی امید کرنا دن میں خواب دیکھنے کے مترادف ہے۔ دیگر مہمانان میں شہر بھیونڈی کے مشہور معالج جناب نثار مقری صاحب اور ڈاکٹر ریحان انصاری نے اپنی موجودگی سے پروگرام کی رونق بڑھائی۔ جناب عامر صدیقی، جناب موثر شیخ اور جناب عبدالصمد خان نے پروگرام کی مشترکہ کامیاب نظامت فرمائی۔ بزم کے سکریٹری جناب عبدالعزیز انصاری نے جملہ مہمانان اور طلبہ و طالبات کا شکریہ ادا کیا۔

پروگرام کے اختتام پر طلبہ کو کیریئر گائیڈنس سے متعلق ایک مفید و معلوماتی کتابچہ ''راہنما'' تقسیم کیا گیا۔ (ڈاک سے)

● قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی کی جانب سے اردو ڈپلوما جو غیر اردو دانوں کے لیے انگریزی یا ہندی میڈیم سے چلایا جا رہا ہے اس کی ایک شاخ سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم میں قائم کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں گذشتہ ہفتے بروز اتوار صبح دس بجے افتتاحی اجلاس منعقد کیا گیا۔ جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا گیا۔ اجلاس کے صدر جناب ایس ضیاء الدین احمد صاحب، کرسپانڈنٹ و جنرل سکریٹری، نے مہمانانِ خصوصی کی شال پوشی کی۔ جناب یوپیر (پرنسپل، سی عبدالحکیم کالج) نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ جناب ایس محمد یاسر (کوآرڈینیٹر این سی پی یو ایل سنٹر، سی عبدالحکیم کالج) نے مہمانانِ خصوصی کا تعارف کرایا۔

محترمہ ڈاکٹر این منگیر کرسی، کنٹرولر آف ایگزامینیشنس، ترووَلّور یونیورسٹی، ویلور، نے اپنے خطاب میں اردو زبان کی اہمیت اور تمل زبان سے موازنہ کرتے ہوئے طلبہ سے کہا کہ سرکاری دفتروں، عدالتوں، اور فوج میں اردو الفاظ کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ الفاظ مقامی تمل زبان میں بھی اسی طرح استعمال کیے جانے لگے ہیں۔

ڈاکٹر پی نثار احمد صاحب، صدر میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے

مہمانوں کی خدمت میں تحفے پیش کیے۔ جلسے کا اختتام قومی ترانے پر ہوا۔
(ڈاک سے)

مشاعرے

● دیوبند، 29 اپریل۔ دیوبند کے سالانہ مذہبی و ثقافتی میلے میں پہلا انڈو پاک مشاعرہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کا افتتاح معروف شاعر ڈاکٹر راحت اندوری نے فیتہ کاٹ کر کیا جبکہ صنعت کار پردیپ رانا نے شمع روشن کی۔ نگر پالیکا چیئرمین حسیب صدیقی نے صدارت اور معروف ناظم مشاعرہ ڈاکٹر انور جلال پوری نے نظامت کی۔ دشواریوں میں روشنی ڈالی۔ مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کی ان میں خالد زاہد مظفر نگری، دل خیر آبادی، رمیش چند سوز اجینی انا دہلوی، الطاف ضیا، شبینہ ادیب، جوہر کانپوری، فصیح اکمل، ذکیہ غزل، پاکستان، ڈاکٹر تسیم نکہت، ڈاکٹر نواز دیوبندی، ریحانہ روحی، پاکستان، راحت اندوری، اجمل سلطانپوری، حمایت علی شاعر، پاکستان کے علاوہ مزاحیہ شاعر فنس کھتولی اور سجاد جھنجٹ نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔

اس انڈو پاک مشاعرے کے کنوینر سید شکیل حسین ایڈووکیٹ اور نگراں سید عقیل حسین (میاں جی) تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● متھرا، 19 اپریل۔ بزم شیدائے ادب، متھرا کے زیر اہتمام 61 ویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مسٹر کنہیا لال پانڈے (سابق ضلع جج) اور جالب علی گڑھی نے مشترکہ طور پر کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی مسٹر بھگت سنگھ ورما (ریٹائرڈ آئی اے ایس) نے شرکت کی۔ بانی بزم سعید اعظمی نے مسٹر بھگت سنگھ ورما کا گل پوشی کر کے استقبال کیا اور قرآن کریم کا ہندی نسخہ بھی انھیں پیش کیا۔ نظامت کے فرائض سید اختر حسین اختر اور ڈاکٹر سعید احمد سعید نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ نعت پاک کے بعد باقاعدہ مشاعرے کا آغاز کیا گیا۔ مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کی ان میں جالب علی گڑھی، کنہیا لال پانڈے، بابو یٰسین خاں شفائی، شمیم متھراوی، سعید اعظمی، مشرف محضر، بشیر صہبائی جاوید اختر وارثی، عالم اعظمی، شکیل تلہری، ساہو تلہری، چھٹن خاں ساحل، حسرت صفی پوری، نصرت شفائی اڑیسہ، ڈاکٹر سعید احمد سعید، حاجی عمر احمد فتح پوریکری، محمد اشفاق ثمر کوسوی، محمد احمد خاں تابش، محمد حسین اختر، بھگوان داس آزاد عارف، ریاض متھراوی، وسیم اعظمی شامل تھے۔ متھرا کے بزرگ استاد شاعر بابو یٰسین خاں شفائی کی گلپوشی کر کے اراکین بزم نے والہانہ استقبال کیا۔ سعید اعظمی نے کہا بابو یٰسین خاں متھرا میں ادب کی شمع کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ مشاعرے کے اختتام پر شعرائے کرام کے لیے شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رسم اجرا

● نئی دہلی، 1857 کی جنگ آزادی جو ملکی سطح پر لڑی گئی تھی انگریزوں کے خلاف طویل عرصے سے پکنے والا وہ لاوا تھا جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا تھا۔ ان خیالات کا اظہار کلشام یہاں ممتاز مورخ عرفان حبیب نے Rebellion 1857 نامی کتاب کے اجرا کی تقریب میں کیا۔

مشہور کمیونسٹ رہنما اور مورخ پی سی جوشی کی ادارت میں شائع ہونے والی اس کتاب کو 1857 کی دستاویزات کا مجموعہ قرار دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انگریزوں کے ظلم کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کے کھلم کھلا اعلان جنگ سے متعلق یہ کتاب اس وقت کے حالات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔ تقریب کا اہتمام کتاب کے ناشر ادارے نیشنل بک ٹرسٹ نے کیا تھا۔

معروف تاریخ داں پروفیسر کے سی یادو نے 1857 کی تحریک آزادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک برطانوی افسر نے تحریری طور پر اعتراف کیا تھا کہ برطانوی حکومت کے خلاف جنگ میں تمام طبقوں کے افراد شامل تھے۔

انھوں نے کہا کہ پنجاب میں جنگ آزادی کی لڑائی مسلمانوں کی قیادت میں لڑی گئی تھی انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ منظم انتقامی کارروائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک عام بات تھی اور اس کا مقصد مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنا اور پستی کے قعر مذلت میں دھکیلنا تھا۔

انھوں نے مسلمانوں کی مذہبی تحریک کا بھی ذکر کیا جس نے انگریزوں کے خلاف ماحول ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ ان ہی تحریکات کا نتیجہ تھا کہ نوے سال بعد انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔

پروفیسر وی این دتہ نے کہا کہ 1857 کی تاریخی دستاویزات کو ہمیں سنبھال کر رکھنا چاہیے اور گاہے بگاہے ان کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ یہ ہمیں 1857 کے تعلق سے ان سلجھی گتھی اور ان کہی کہانی کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین شمس الرحمن فاروقی نے کتاب کے مشمولات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ جہاں یہ کتاب ہمیں 1857 کے حالات سے باخبر کراتی ہے وہیں انگریزی جبر و تشدد اور ہندوستانی عوام کے رخ کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

تقریب کی صدارت اور کتاب کا اجرا مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ کو کرنا تھا لیکن وہ سرکاری مصروفیت کی وجہ سے اس تقریب میں شرکت نہیں کر سکے۔ تقریب کی نظامت نیشنل بک ٹرسٹ کے چیئرمین وپن چندرا نے کی اور اس کی ڈائرکٹر محترمہ نزہت حسن نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اعلان کیا کہ 1857 کے تعلق سے دستاویزات پر مبنی اس کتاب کا ترجمہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں کرایا جائے گا۔ اس تقریب کے اہم شرکاء میں سی پی آئی کے جنرل سکریٹری اے بی بردھن، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے صدر سید شہاب الدین، ساہتیہ اکادی کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی وغیرہ شامل تھے۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

● نئی دہلی، مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جامعہ ہمدرد کے چانسلر اور معروف ماہر تعلیم سید حامد نے کہا ہے کہ اردو والوں کو اردو زبان کے تحفظ کی خاطر کمر کس کر میدان میں آنے کی ضرورت ہے اور ہمیں اردو کے فروغ کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس کرنا چاہیے۔ انھوں نے یہ باتیں نئی کتاب پبلشنگ ہاؤس کے سہ ماہی رسالے نئی کتاب کے اجرا کے موقع پر کہیں۔ سید حامد نے نئی کتاب پبلیکیشنز کا افتتاح کرنے کے بعد بطور مہمان خصوصی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس ادارے کے مالک اور رسالے کے مدیر شاہد علی خاں سے ایک زمانے سے واقف ہیں اور ان کے کاموں کی ستائش کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ مکتبہ جامعہ سے سبکدوشی کے بعد شاہد علی خاں نے جو ادارہ قائم کیا ہے وہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم رول ادا کرے گا اور اس رسالے سے نئے لکھنے والے تیار ہوں گے۔ رسالے کا اجرا جوگندر پال نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ جب کوئی رسالہ تحریک بن جاتا ہے تو اس کی اہمیت و افادیت کسی یونیورسٹی سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ آج اردو رسائل و جرائد خریدنے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے جبکہ ضرورت اس کی ہے کہ ہم کتابوں کو اپنا دوست بنائیں۔

پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ شاہد علی خاں کے کاموں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک شخص نہیں بلکہ ایک ادارہ اور ایک تحریک ہیں۔ وہ اصلی جامعی ہیں اور اس لیے ان کے اندر حرکت پذیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو دنیا کو اس نئے رسالے اور اشاعتی ادارے کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اس تقریب میں خواجہ شاہد نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ شاہد علی خاں کا نام اردو دنیا میں معیار کی ضمانت ہے۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی نے کہا کہ شاہد علی خاں نے مکتبہ جامعہ کو جس جاں نفشانی سے چلایا وہ قابل تعریف ہے انھوں نے جس طرح ایک نیا ادارہ قائم کیا اور اس سے ایک نیا رسالہ جاری کیا اس کی پذیرائی اردو والوں کو کرنی چاہیے۔ پروفیسر صغریٰ مہدی نے کلمات تشکر ادا کیے۔ اس موقع پر دہلی کے اردو حلقوں کی مقتدر شخصیات بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 10 مئی۔ 1857 پہلی جنگ آزادی کی 150ویں سالگرہ کے موقع پر سرسید فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر اینکسی میں مورخ کے ایم ایس خان کی نئی کتاب ''اے سیکویشن آف ٹرتھ'' اور پروفیسر ایس ایم عزیزالدین حسین کی کتاب ''1857 ری ویزیٹڈ'' کا اجرا راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین کے رحمٰن خان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر خصوصی لیکچر اور گروپ مباحثہ کا بھی انعقاد کیا گیا۔ پروگرام میں اے آر شیروانی، ایس فاروق، ایران کلچر ہاؤس کے ایم ایچ مظفری، صدیق الرحمٰن قدوائی، محمد ناظم، ڈی پی ایس تور، کمال فاروقی وغیرہ سمیت متعدد شخصیات موجود تھیں۔ کتابوں کا اجرا کرتے ہوئے کے رحمٰن خان نے کہا کہ آج ہم آزادی کی جس کھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں وہ ہزاروں، لاکھوں مجاہدین آزادی کی قربانیوں کا ہی نتیجہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مورخوں نے تاریخ کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ انھوں نے اس جلسے کے لیے سرسید فاؤنڈیشن اور کتابوں کے مصنفوں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں ہی کتابیں 1857 کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے لائیں گی اور ان مجاہدین آزادی کو بھی منظر عام پر لائیں گی جو تاریخ کی گرد میں کہیں کھو گئے تھے۔ کے ایم ایس خان نے اپنی کتاب ''اے سیکویشن آف ٹرتھ'' کے بارے میں کہا کہ میری یہ دلی خواہش تھی کہ ہمارے جن بزرگوں نے آزادی کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور جنھیں فراموش کر دیا گیا، ان کے نام بھی منظر عام پر آئیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا جو اثاثہ آرکائیوز وغیرہ کی گرد و غبار میں دفن ہے، اسے منظر عام پر لایا جائے اور مجاہدین کی قربانیوں سے ہر خاص و عام کو واقف کرایا جائے۔ پروفیسر عزیزالدین حسین نے اپنی کتاب کے بارے میں بتایا کہ سرسید 1857 کی جنگ آزادی کے گواہ تھے۔ 1857 کی جنگ آزادی پر انھوں نے جو دستاویز جمع کیے تھے انھی دستاویزوں میں سے 1857 کی 150ویں سالگرہ کے موقع پر 150 دستاویزوں کو بنیاد بنا کر یہ کتاب تصنیف کی گئی ہے۔ اس موقع پر پروفیسر خواجہ شاہد نے کہا کہ جنگ آزادی کے مجاہدین کے بارے میں نہ تو ہمارے پاس لوک گیت ہیں اور نہ ہی لوک کہانیاں، کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری نئی نسل دھیرے دھیرے ان سے نا آشنا ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے اس طرح کی تقاریب ہوتی رہنی چاہیے تاکہ آزادی کے مجاہدین اور سورماؤں کے بارے میں ہماری نئی نسل کو معلومات حاصل ہو سکیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 4 مئی۔ نارنگ ساقی کی تازہ ترین مرتب کردہ کتاب ''خوش کلامیاں قلم کاروں کی'' کا اجرا پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بدست آج ساہتیہ اکادمی کے اڈیٹوریم میں کیا گیا۔ تقریب کا اہتمام حلقۂ ارباب ذوق اور ایم آر پبلیکیشنز کے اشتراک سے ہوا۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر خلیق انجم نے کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ مہمان خصوصی تھے۔ نظامت کے فرائض مخمور سعیدی نے انجام دیے۔ اس موقع پر خواجہ حسن ثانی نظامی، جوگندر پال، نصرت ظہیر، شاہد ماہلی، سید شاہد مہدی، مظہر امام، بلراج ورما، محمد علی صدیقی، شریف الحسن نقوی، اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے علاوہ متعدد ادبا و دانشوران موجود تھے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ نارنگ ساقی اردو زبان کا سرمایہ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہنسنا ہنسانا انسانی فطرت ہے لیکن لطیفے تبھی وجود میں آتے ہیں جب زبان پر عبور حاصل ہو۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ لطیفے ہماری تاریخ ادب کا حصہ ہیں اور ادب میں پہلی بار سنجیدہ طنز و مزاح کو محمد حسین آزاد نے داخل کیا ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور نارنگ ساقی کو اپنی نیک خواہشات سے نوازا۔ جوگیندر پال نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس کتاب کی بڑی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی نصرت ظہیر نے ایک مضمون پڑھا اور متین امروہوی نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● علی گڑھ، 19اپریل۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سرسید اکیڈمی کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر افتخار عالم کی کتاب ''سرسید درون خانہ'' کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر مسعود الحسن نے کہا کہ پروفیسر افتخار عالم کی یہ تصنیف جدید سوانح عمری کے اصولوں پر کھری اترتی ہے۔ ابن سینا اکیڈمی کے زیر اہتمام رسم اجرا کی اس تقریب کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر مسعود الحسن نے فاضل مصنف سے اپیل کی کہ وہ اب علی گڑھ کے مستقبل پر بھی کچھ لکھیں۔ اس سے قبل پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ سرسید سے متعلق جو بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں سرسید سے عقیدت مندی کا اظہار کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی شخصیت کا مکمل احاطہ کرنے کے لیے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ منفی پہلوؤں کو بھی سامنے لانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید پر جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں 70 فیصد حصہ الطاف حسین حالی کی کتاب ''حیات جاوید'' سے ماخوذ ہے جب کہ افتخار عالم کی اس کتاب میں معروضیت کے ساتھ ساتھ منطقی اور سائنٹفک طریقہ اپنایا گیا ہے۔ سرسید کے سیاسی موقف کے بارے میں پروفیسر افتخار عالم نے یہ واضح کردیا ہے کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج کی کوشش سے بہت پہلے انگریزوں اور ان کی حکومت سے متعلق سرسید اپنی حکمت عملی وضع کرچکے تھے۔ ماہر معاشیات پروفیسر اولاد احمد صدیقی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے سرسید کے دور کے اہم واقعات اور حادثات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن نے کہا کہ افتخار عالم کی یہ کتاب سرسید شناسی میں ایک اہم اضافہ تصور کی جانی چاہیے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 12اپریل۔ کہانی کار کو بیشتر چیزیں معلوم ہونی چاہیے۔ تخلیق کار جب تک خارجی واقعات کو داخلی بناکر نہیں پیش کرتا اس کی کہانی میں جان پیدا نہیں ہوسکتی۔ ان خیالات کا اظہار غالب اکیڈمی میں بزم ہم قلم کے زیر اہتمام ذکیہ ظفر کے افسانوں کے مجموعے ''سوغات'' کے اجرا کے موقع پر صدارتی کلمات میں مشہور افسانہ نگار جوگندر پال نے کیا۔ نظامت کرتے ہوئے نگار عظیم نے کہا کہ دھیمی دھیمی آنچ میں تپتے یہ افسانے عورت کے دل کی سوغات ہیں۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ ذکیہ ظفر کی کہانیوں کی خاصیت اختصار ہے۔ ان کی کہانیوں میں مظلوم عورتوں اور ان سے ہمدردی کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی کہانیاں سماج کی سچی عکاسی کرتی ہیں۔ مہمان خصوصی ہندی کی دانشور ریکھا جین نے کہا کہ ان افسانوں میں درد وغم کا سیلاب امڈ رہا ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ مصنفہ نے شعور کی بلوغت کو پہنچنے کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ انجم عثمانی نے کہا کہ ان کی 18 کہانیوں کو پڑھنے کے بعد شخصیت سے کہیں زیادہ تخلیقات عمدہ اور بہتر نظر آتی ہیں۔ مصنفہ ذکیہ ظفر نے کتاب سے ایک افسانہ پڑھ کر شرکا کو محظوظ کیا۔ اس موقع پر عبدالرحمن، ترنم ریاض نے بھی ذکیہ ظفر کو مبارکباد پیش کی۔ شرکا میں ابرار کرت پوری، معین شاداب، ذکیہ ظفر کے شوہر ظفر کے نام قابل ذکر ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● اندور۔ اندور کے کہنہ مشق شاعر جناب مقصود نشتری کے دوسرے مجموعۂ کلام ''تحریر'' کا اجرا مقامی گاندھی ہال میں کیا گیا۔ جلسے کی صدارت سابق وزیر حکومت مدھیہ پردیش جناب مجن سنہا ورمانے کی۔ مہمان خصوصی اندور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب اے اے عباسی ڈاکٹر راحت اندوری تھے۔ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر راحت اندوری نے کہا کہ مقصود نشتری کی تخلیقی ریاضت لگ بھگ آدھی صدی کو چھو رہی ہے۔ چار ساڑھے چار دہائیوں کی ان کی شعری مشق آج بھی ان کے تازہ دم ہونے کا مژدہ سناتی ہے اور ان کا قلم ان کے جوان ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ مقصود نشتری کی شاعری کا بیشتر حصہ ایسی غزلیات پر مشتمل ہے جو سنجیدگی کی پاسداری کرتی ہیں اور اپنی شعری روایت کی امانت دار ہیں۔ مقصود نشتری دیکھنے والی نظر اور محسوس کرنے والا دل رکھتے ہیں جو ایک اچھے شاعر کا اثاثہ ہے۔ اظہار کے سلیقے پر مقصود کے فن نے ایسی مہر لگائی ہے جو گزرے ہوئے کل کی وارث بھی ہے اور عہد حاضر کی چشم دید گواہ بھی اور یہی ان کی شاعری کا جواز ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اکادمی کے چیئرمین جناب افتخار منا انصاری نے اپنے استقبالیہ میں کہا کہ ''تحریر'' اکادمی کی پانچویں اشاعت ہے۔ اکادمی کے مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے جناب افتخار منا انصاری نے کہا کہ عنقریب شہر کے ہر حصے میں اردو مدرسے کی شروعات اکادمی کی جانب سے کی جانے والی ہے جس سے ہم اردو کی بقا کی طرف قدم آگے بڑھانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

علی باقر

● نئی دہلی، ترقی پسند مصنف سجاد ظہیر کے داماد اور اردو کے معروف افسانہ نگار سید علی باقر کا 5 مئی کو صبح حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ پروفیسر نجمہ ظہیر باقر اور بیٹی سیما باقر شامل ہیں۔

دہلی اردو اکادمی نے انھیں 2005 میں تخلیقی ادب کے ایوارڈ سے نوازا تھا۔ وہ عارضۂ قلب میں مبتلا تھے اور تقریباً دس سال قبل ان کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی تھی۔ حال ہی میں دوبارہ تکلیف ہوجانے کے سبب ان کا گنگارام اسپتال میں علاج کرایا گیا تھا۔

علی باقر کا تعلق حیدرآباد کے ایک علمی و ادبی خانوادے سے تھا۔ نجمہ ظہیر سے شادی کے بعد سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر کی تربیت سے ان کی صلاحیتوں میں اور نکھار آیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے لگ بھگ 40 سال انگلینڈ میں گزارے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہیں درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ علی باقر کا شمار اردو کے اچھے افسانہ نگاروں میں تھا اور ایک زمانے میں اردو کے معروف ترین رسائل ماہنامہ شمع، بیسویں صدی اور روبی میں ان کے افسانے تواتر سے شائع ہوتے تھے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے اور قارئین نے انھیں پسند کیا۔ ''لندن کے رات دن''، ''خوشی کا موسم''، ''جھوٹے وعدے سچے وعدے''، ''بے نام رشتے'' اور ''مٹھی بھر دل'' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ کچھ مدت پہلے انھوں نے سجاد ظہیر کی نایاب کتاب ''روشنائی'' کو ایڈٹ کرکے دوبارہ شائع کیا تھا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

تبصرہ وتعارف

● کلیاتِ مصحفی (جلد ہفتم)
مرتب: نورالحسن نقوی
صفحات: 337، قیمت: -/236 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: محمد عمر رضا، ای۔224، جھاندی ہوسٹل، جے این یو،
نئی دہلی۔110067

قومی اردو کونسل نے اپنے ایک اہم منصوبے کے تحت اٹھارھویں صدی کے اہم اور معتبر شاعر غلام ہمدانی مصحفی کے جملہ شعری سرمایے کو یکجا کر کے کلیات کی شکل میں از سرِ نو شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ''کلیاتِ مصحفی (جلد ہفتم)'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کلیاتِ مصحفی کی ساتویں جلد اس سے قبل پہلی بار 1975 میں مجلس اشاعت ادب دہلی سے شائع ہوئی تھی جسے حفیظ عباسی نے ترتیب دیا تھا۔ بعد میں اسے نورالحسن نقوی نے ترتیب دیا جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے 1995 میں شائع کیا لیکن اس کی دستیابی ایک مشکل امر بنتی جا رہی تھی جس کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے نورالحسن نقوی کی مدد سے اسے از سرِ نو شائع کیا ہے۔

مصحفی نے یوں تو شاعری کی مختلف اصناف مثلاً قصیدہ، مثنوی، رباعی اور مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن شاعری میں ان کا خاص میدان غزل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیاتِ مصحفی کی دیگر جلدوں کی طرح اس جلد میں بھی ان کی غزلوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس جلد میں ان کی غزلوں کی کل تعداد 551 ہے۔ علاوہ ازیں آخر میں پانچ عدد رباعیاں، سات عدد قطعات، ایک عدد مثنوی، دو عدد مخمس اور چار عدد سلام درج ہیں۔ کلیات کی ابتدا میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون بعنوان ''مصحفی ریختہ کہتا ہوں میں...'' بے حد معلومات افزا ہے۔ مصحفی کی زودنویسی اور بسیار نویسی کا عالم یہ تھا کہ ایک بار جو کچھ لکھ دیا اسے دوبارہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس بات کا خود مصحفی کو بھی احساس تھا اور اس سے وہ پرہیز بھی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ انھوں نے کہا ہے۔

تجھ کو کیا بسیار گوئی سے ہے کام اے نغز گو
مصحفی موقوف کر اس کثرت اشعار کو

لیکن اس احساس کے باوجود وہ اپنی اس روش کو ترک نہیں کر پائے جس سے ان کی شاعری یقیناً متاثر ہوئی پھر بھی کلیاتِ مصحفی میں جا بجا ایسے بہت سے دمکتے ہیرے نظر آتے ہیں جو قارئین کو مصحفی کی شعری عظمت کا بخوبی احساس دلاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں میر سوز کا انداز، میر تقی میر کی تقلید اور سودا کا اسلوب بیان ہونے کے باوجود ان کا اپنا ایک منفرد اسلوب اور لب ولہجہ بھی ہے جس کا اندازہ مصحفی کے کلام کے مطالعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر غزل کے لیے انھوں نے اظہار و بیان کا جو لطیف پیرایہ تیار کیا ہے، وہ بے حد اہم ہے۔ ان کی شاعری نشاطِ شباب اور حسن کی رعنائیوں اور رنگینیوں سے پر ہے۔ مصحفی کے یہاں نادر لفظیات، دل پسند ترکیبیں اور بلندیِ خیال جا بجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مصحفی نے جب لکھنؤ کا رخ کیا تو دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات سے بھی متاثر ہوئے لیکن انھوں نے کسی ایک رنگ کو اپنی شاعری پر غالب نہیں ہونے دیا بلکہ اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کی۔ بقول ڈاکٹر یوسف سرمست ''مصحفی کے ہاں داخلیت اور خارجیت کا بڑا متوازن امتزاج پایا جاتا ہے۔ مصحفی کی شاعری لکھنؤ اور دہلی کی بہترین شعری روایات کا امتزاج ہے لیکن یہ محض ان کی ''قوتِ آخذہ'' یا ''تقلید اور انتخابیت'' کا نتیجہ نہیں۔''
(عرفانِ نظر، ص10)

اس اہم اور معتبر شاعر کے کلیات کا از سرِ نو شائع ہونا فالِ نیک ہے۔ عام قارئین کی سہولت کے لیے نورالحسن نقوی نے حاشیے میں مشکل الفاظ کے معانی کو درج کر دیا ہے نیز مزید تشریح طلب باتوں کی جس طرح وضاحت و صراحت کی ہے، اس سے کلیات کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ قومی اردو کونسل اور مرتب نورالحسن نقوی دونوں ہی اس اہم کام کے لیے بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

● انتخاب کلام حسرت
مرتب: ڈاکٹر فضل امام
صفحات: 91، قیمت: -/43 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: عبدالرب، 265، سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔67

حسرت موہانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ حسرت نے اپنی تنقیدی تحریروں میں شعرا کے سلسلہ ہائے تلمذ کو بڑی اہمیت دی ہے اور ہمارے بیشتر کلاسیکی شعرا کے سلسلوں کی تاریخ پہلی مرتبہ حسرت نے ہی مرتب کی۔ اس لحاظ

سے خود حسرت کی تعیین قدر بھی اسی نقطۂ نظر سے کی جانی چاہیے۔ اس زاویے سے نگاہ ڈالیں تو حسرت کا سلسلۂ تلمذ تسلیم کے توسط سے مومن خاں مومن تک پہنچتا ہے گویا وہ مومن کے سلسلے کے شاعر ہیں۔ بلاشبہ مومن غزل کی ایک خاص روایت کے امین رہے ہیں۔ ان کا تغزل سید ہ جعفر کے بقول رنگ اور خوشبو سے عبارت تھا اور یہ خصوصیت حسرت کی شاعری میں بھی جلوہ گر ہے۔

حسرت موہانی اپنی ذاتی زندگی میں مولوی بھی ہیں اور مجاہد آزادی بھی۔ ترقی پسندوں کی کانفرنس میں فحاشی پر پابندی عائد کرنے کا جب فیصلہ کیا گیا تو حسرت نے شدت سے اس کی مخالفت کی اور اسے آزادیِ اظہار کے منافی قرار دیا۔ انھوں نے اپنا کلیات مرتب کرتے ہوئے جو عنوانات قائم کیے تھے ان میں ایک عنوان ''فاسقانہ کلام'' کا بھی تھا۔

حسرت کی پوری شاعری کیف و مستی اور رنگینی و رعنائی کی ایک عجیب و غریب کیفیت سے مملو ہے۔ طلبہ کی نصابی ضرورتوں کے پیشِ نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 'انتخاب کلام حسرت' شائع کیا ہے۔ اس کے مرتب ڈاکٹر فضل امام ہیں۔ انھوں نے اس انتخاب پر ایک مختصر مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں اردو غزل کی تاریخ میں حسرت موہانی کے صحیح مقام و مرتبے کے تعین کی کوشش کی ہے ساتھ ہی اس انتخاب میں حسرت کے کل تیرہ دواوین سے الگ الگ انتخاب پیش کیا ہے، اس طرح کم سے کم وقت میں حسرت کے ہر دیوان کے رنگ و آہنگ کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ حسرت کے جملہ دواوین میں اس قسم کے عمدہ اشعار موجود ہیں:

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا
تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام
اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

دیکھیں جو اور کو بھی تجھے دیکھنے کے بعد
اے حسن یار ہم وہ نہیں ہیں نظر فروش

امید ہے کہ کلام حسرت کے اس نمائندہ انتخاب سے طلبہ اور اساتذہ یکساں طور پر فیضیاب ہو سکیں گے۔

● **چار درویشوں کا قصہ**

مرتب: نورالحسن نقوی

صفحات: 95، قیمت:- 16/ روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ۔ 6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

مبصر: عبدالسلام صدیقی، کوارٹر نمبر 5، بی پی ڈبلوڈی، سیکٹر۔ 5، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی۔ 110022

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادب اطفال کو شائع کرنے کا جو جامع منصوبہ بنایا ہے ''چار درویشوں کا قصہ'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ 1800 میں انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی۔ اس کالج میں عربی فارسی اور سنسکرت سے سلیس اور آسان اردو زبان میں ترجمے کے لیے ملک کے کونے کونے سے ادیبوں کو بلایا گیا۔ انھی مصنفین میں میر امّن دہلوی بھی شامل تھے۔ میر امّن نے بڑی سیدھی سادی اور آسان زبان میں فارسی تصنیف ''قصہ چہار درویش'' کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام 'باغ و بہار' رکھا۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نے اسے بچوں کے لیے مختصر اور آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے قدیم دور کے بہت سے الفاظ اور محاورے جو آج نا مانوس ہیں خارج کر دیے ہیں۔

آغاز قصہ میں بادشاہ آزاد بخت کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو ملک روم کا بادشاہ تھا۔ اولاد نہ ہونے کے باعث وہ بے حد پریشان تھا جب کہ اس کی رعایا بے حد خوشحال تھی۔ ایک دن آئینے میں اسے سر میں ایک سفید بال نظر آتا ہے جس سے وہ اور بھی پریشان ہو جاتا ہے اور گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے جس کے باعث ملک کا نظم و نسق بگڑنے لگتا ہے۔ سبھی درباری اور عہدے دار فکر مند ہو گئے اور وزیر کو لے کر بادشاہ کے پاس گئے۔ وزیر نے بادشاہ کو سمجھایا اور خدا کی ذات سے پرامید رہنے کو کہا۔ جس کے بعد بادشاہ واپس تخت نشین ہو جاتا ہے۔ ایک دن قرآن پاک میں بادشاہ نے پڑھا کہ کوئی بہت پریشان ہو تو قبرستان چلا جائے اور وہاں پہنچ کر مردوں سے نصیحت حاصل کرے۔ بادشاہ اس پر عمل کرتا ہے اور وہاں اسے چار درویش نظر آتے ہیں جو اپنی اپنی داستان سنا کر غم غلط کر رہے ہیں بادشاہ چھپ کر ان درویشوں کی داستان سننے لگتا ہے۔

پہلا درویش ملک یمن کے بڑے سوداگر خواجہ احمد کا بیٹا تھا جس کی تجارت بڑے بڑے ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد وہ عیش وعشرت میں پڑ جاتا ہے آخر میں بہت مفلس ہو جاتا ہے اور کھانے تک کو اس کے پاس کچھ نہیں رہ جاتا۔ بہن کی مدد سے دوبارہ تجارت شروع کرتا ہے۔ دمشق میں پہلے درویش کی ملاقات دمشق کی شہزادی سے زخمی حالت میں ہوتی

ہے وہ عینی جراح سے اس کا علاج کرواتا ہے اور شہزادی صحت یاب ہو جاتی ہے۔ دعوت میں شہزادی، یوسف سوداگر اور اس کی دوسری محبوبہ کو قتل کرا دیتی ہے اور یمن کے شہزادے سے شادی کر لیتی ہے اور دونوں وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ راستے میں شہزادی غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے فراق میں شہزادہ دیوانہ اور پاگل ہو جاتا ہے اور ملک شام میں اسے تلاش کرتا ہے۔ آخر میں خودکشی کرنے لگتا ہے عین اسی وقت ایک نقاب پوش بزرگ اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور ملک شام جانے کی ہدایت کرتے ہیں۔

دوسرا درویش ملک فارس کا شہزادہ تھا۔ وہ حاتم طائی کا قصہ سن کر اس جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک فقیر اسے بتاتا ہے کہ تو کیا سخی ہے تجھ سے زیادہ سخی تو بصرہ کی شہزادی ہے۔ دوسرا درویش شہزادی کی شہرت سن کر اس سے ملنے کے اشتیاق میں بصرہ کی جانب کوچ کرتا ہے۔ شہزادہ اس سے متاثر ہو کر شادی کا پیغام دیتا ہے۔ شہزادی ایک شرط رکھتی ہے کہ جو شخص ملک نیم روز کے نوجوان کے حالات کی خبر لائے گا وہ اسی سے شادی کرے گی۔ دوسرا درویش ملک نیم روز کے لیے کوچ کرتا ہے اور وہاں شہزادے سے ملاقات ہو جاتی ہے شہزادہ اپنی کہانی سناتا ہے۔ اس کی کہانی کو سن کر ملک فارس کا شہزادہ خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی موقع پر نقاب پوش نمودار ہوتا ہے اور اسے ملک روم جانے کی ہدایت دیتا ہے۔

تیسرا درویش ملک عجم کا شہزادہ تھا اسے سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ اس کی ملاقات نعمان سیاح سے ہوتی ہے جو ملک فرنگ کی شہزادی کا عاشق تھا۔ عجم کے شہزادے کی شادی بڑی مشکلوں اور پریشانیوں کے بعد فرنگ کی شہزادی سے ہو جاتی ہے۔ اس کی ملاقات بہزاد خاں سے ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے شہزادے اور شہزادی ملک سے نکلنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ملک پہنچنے پر بادشاہ ان کا استقبال کرتا ہے اتفاق سے شہزادی اور بہزاد خاں دریا میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس غم سے شہزادہ دیوانہ ہو جاتا۔ خودکشی کرتے وقت اسے وہی نقاب پوش بزرگ دکھائی دیتے ہیں جو اس کی رہبری کرتے ہیں اور اسے بھی ملک روم جانے کی ہدایت دیتے ہیں۔

چوتھا درویش ملک چین کا شہزادہ تھا۔ بادشاہ نے مرتے وقت اپنے چھوٹے بھائی کو وصیت کر دی تھی کہ میرے مرنے کے بعد شہزادے کی شادی اپنی لڑکی اختر سے کر دینا اور سلطنت کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں سونپ دینا۔ بعد ازاں بادشاہ کے بھائی کی نیت خراب ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے بھتیجے کو ہی راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اس کا ایک حبشی غلام مبارک شہزادے کی پوری مدد کرتا ہے۔ وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہی نقاب پوش بزرگ ایک بار پھر تشریف لاتے ہیں اور رہبری کرتے ہیں اور اسے ملک روم جانے کی ہدایت کرتے ہیں جہاں تین درویش پہلے سے پہنچے ہوئے تھے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی نے باغ و بہار کی تلخیص پیش کر کے اسے آسان اور عام فہم بنا دیا ہے جس سے قصے کو پڑھنے اور سمجھنے میں طلبہ اور بچوں کو بہت آسانی ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ بچوں کے علاوہ بڑے بھی اس تلخیص کو پسند کریں گے۔

● **سہ ماہی فکر و تحقیق**

شمارہ نمبر-2، جلد نمبر-10، اپریل تا جون 2007

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

مشیر: مخمور سعیدی

معاون مدیر: ڈاکٹر رئیس احمد

صفحات: 160، قیمت -/25 روپے، زر سالانہ 100 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: ابو فہیم خاں، J3A/28A، کھڑکی ایکسٹینشن، مالویہ نگر، نئی دہلی-110017

سہ ماہی فکر و تحقیق کا زیر تبصرہ تازہ شمارہ (اپریل تا جون 2007) تحقیق، تنقیدی اور تاریخی نوعیت کے 8 مضامین پر مشتمل ہے جو اس طرح ہیں۔ 'کلیات میر کے قلمی نسخے — رفاقت علی شاہد، 'افلاطون کے تنقیدی تصورات — ناصر عباس نیر، 'مولوی مہیش پرشاد کی غالب شناسی' — شمس بدایونی، 'اردو افسانے کا سفر — ' پرویز شہریار، 'ہم وزن چھند اور بحریں' — کندن اراولی، 'تمل ناڈو میں اردو صحافت' — سید سجاد حسین، 'غالب کا ایک نایاب دنو یافتہ فارسی خط' — مختار علی خاں، 'علی سردار جعفری کی غزل گوئی' — محمد عمر رضا، — علاوہ ازیں 'بازگشت' کے عنوان سے سید ارشاد حیدر کا ایک خط شامل ہے جس میں سہ ماہی فکر و تحقیق کے داغ دہلوی نمبر پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

پہلے مضمون میں رفاقت علی شاہد نے کلیات میر کے 12 دستیاب قلمی نسخوں کے تعارف کے علاوہ تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نگاہ سے ان کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ کلیات میر کی ترتیب و تدوین کے تعلق سے اس تقابلی مطالعے کی بڑی اہمیت ہے۔ رفاقت علی شاہد جن بارہ قلمی نسخوں کو زیر بحث لائے ہیں وہ اس طرح ہیں۔ 'نسخۂ ہارکر/ملائشیا'، 'نسخۂ لندن'، 'نسخۂ رام پور/اول دوم'، 'نسخۂ ندوہ'، 'نسخۂ علی گڑھ'، 'نسخۂ آصفیہ'، 'نسخۂ کلکتہ' (اول، دوم و سوم) 'نسخۂ گوالیار'، 'نسخۂ ناصریہ' متذکرہ جملہ قلمی نسخہ جات کلیات میر کی جدید ترتیب و تدوین میں معاون ثابت ہوں گے اس اعتبار سے رفاقت علی شاہد کا یہ تحقیقی مضمون میر شناسی کے ذیل

میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

دوسرا مضمون ناصر عباس نیر کا 'افلاطون کے تنقیدی تصورات' ہے جس میں شاعری کی ماہیت، شاعری کے اثرات، شاعری کے معاشرتی اور سماجی کردار کے علاوہ شاعرانہ تخلیقی عمل سے متعلق افلاطون کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ پورے مضمون کا محور و مرکز افلاطون کے تنقیدی نظریات ہیں۔ شمس بدایونی نے مولوی مہیش پرشاد کی غالب شناسی پر اظہار خیال کیا ہے جس میں مولوی مہیش پرشاد کے مختصر احوال و کوائف کے علاوہ مولوی مہیش پرشاد کی غالب شناسی کے ذیل میں خطوط غالب کی ترتیب و تدوین پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ شمس بدایونی کا یہ مضمون غالبیات کے ضمن میں ایک گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

جناب پرویز شہریار، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنے مضمون 'اردو افسانے کا سفر' میں اردو افسانے کی تکنیک سے متعارف کراتے ہوئے اردو افسانے کے تاریخی سفر پر اجمالاً گفتگو کی ہے۔ کندن اراولی کا مضمون۔ 'ہم وزن چھند' اور 'بحریں' اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے نہایت وقیع اور معلومات افزا ہے۔ 'تمل ناڈو میں اردو صحافت' کے عنوان سے سید سجاد حسین نے تمل ناڈو میں اردو صحافت کے تاریخی سفر پر روشنی ڈالی ہے۔ مختار علی خاں (پرتو روہیلہ) نے غالب کے ایک نایاب و نویافتہ فارسی خط سے متعارف کرایا ہے۔ مختار علی خاں کے استدلالی اور منطقی اسلوب بیان نے مضمون کو جامعیت عطا کردی ہے۔ آخری مضمون میں محمد عمر رضا نے علی سردار جعفری کی غزل گوئی کو موضوع بنایا ہے۔ بہ اعتبار مجموعی سہ ماہی فکر و تحقیق کا یہ شمارہ اپنے مختلف النوع مضامین کی شمولیت کے باعث نہایت وقیع، معلوماتی اور معیاری ہے۔ اس خوبصورت اور معیاری اشاعت پر مجلس ادارت اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارکباد کی مستحق ہے۔

جدید نظم ــــ حالی سے میراجی تک

مصنف: کوثر مظہری

صفحات: 448، قیمت: -/250 روپے

ناشر: مظہر پبلی کیشن، A-1، جوگابائی ایکسٹینشن، بٹھوری روڈ، نئی دہلی۔ 25

مبصر: احمد کفیل، ای۔ 301، برہم پتر ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔ 67

''جدید نظم ــــ حالی سے میراجی تک'' کوثر مظہری کی تنقیدی و تجزیاتی نوعیت کی کتاب ہے جو قومی اردو کونسل کے جزوی مالی اشتراک سے نومبر 2005 میں شائع ہوئی ہے۔ اس سے قبل کوثر مظہری کی دو تنقیدی نوعیت کی کتابیں ''جواز و انتخاب'' اور ''جرأت افکار'' زیور اشاعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ''جدید نظم ــــ حالی سے میراجی تک'' پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں نظم کے لغوی و اصطلاحی مفہوم، فن کے معیار اور زندگی سے روابط پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو میں نظم نگاری کی روایت کے ساتھ ساتھ اس کے جدید رجحانات، ''انجمن پنجاب'' (1874) سے ترقی پسند تحریک (1936) اور حلقۂ ارباب ذوق (1939) تک کے فکری میلانات سے بحث کی ہے۔

دوسرا باب ''شعر و ادب اور تہذیبی تناظر'' کے عنوان سے ہے جس میں اردو، انگریزی، ہندی اور فارسی کے قدیم و جدید فن پاروں کو ان کے تخلیقی عہد کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ موصوف کا تنقیدی نظریہ یہ ہے کہ فرد اپنے وجود کی بقا کے لیے اجتماعی زندگی کا دست نگر ہوتا ہے لہٰذا اس باب میں تہذیب و ثقافت کو سمجھنے کے لیے مشرقی و مغربی تہذیبوں کے علاوہ اہم مفکرین اور ان کی تصانیف کا معروضی مطالعہ پیش کیا ہے اور فن پاروں کی بقا کے لیے تہذیب و ثقافت کے انصرام کو لازمی امر قرار دیا ہے۔ تیسرے باب میں ''انیسویں صدی کی نظم ــــ تہذیبی سیاق میں'' کے تحت جدید اردو نظم نگاری کے پس منظر اور پیش منظر کا ذکر کیا ہے۔ 1800 میں فورٹ ولیم کالج کے قیام، 1828 میں ''برہمو سماج'' کی تاسیس، ''پرارتھنا سماج'' کی تشکیل، 1857 کی ناکام جنگ آزادی، وہابی تحریک اور سرسید تحریک سے لے کر مغربی علوم و فکر کے زیر اثر انگریزی نظموں کے تراجم مولانا قلق میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، حالی اور نظم طباطبائی وغیرہ نے پیش کیے اور جو نئے ہیئتی تجربے عبدالحلیم شرر نے ''دلگداز'' میں پیش کیے ان رجحانات کی مکمل وضاحت پیش کی ہے جن کے زیر اثر اردو میں جدید نظم نگاری کا ایک رخ متعین ہوا اور جس پر پہلی کانفرنس آزاد اور حالی کی صدارت میں 1874 میں ''انجمن پنجاب'' کے اہتمام سے منعقد ہوئی اور پھر سلسلہ وار دس مشاعروں میں قلم کاروں کی ذہنی تشکیل کی گئی۔ اس باب میں مذکورہ معروضات کے مطالعے کے بعد اس دور کے جن 14 اہم نظم نگاروں کا مطالعہ کیا گیا ہے ان میں حالی، آزاد، اسماعیل میرٹھی، اکبرالٰہ آبادی، شبلی، سرور جہاں آبادی، علامہ اقبال، عظمت اللہ خاں، چکبست، جوش، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، جمیل مظہری اور احسان دانش کے نام شامل ہیں۔

چوتھے اور پانچویں باب (ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق) کو مصنف نے ''دو متوازی میلانات'' کا نام دیا ہے۔ چونکہ ان دونوں تحریکات کے منشور میں کچھ بنیادی اختلافات تھے اس لیے ان سے وابستہ قلم کاروں میں آپسی چپقلش بھی رہی۔ ترقی پسند تحریک کی طرف سے علی سردار جعفری اور حلقۂ ارباب ذوق کی طرف سے میراجی کے درمیان جو مباحثے اور مناظرے ہوئے ان کے ذکر کے ساتھ ان ادبی تحریکات کی بنیاد، ان سے وابستہ ادبا و شعرا، ان کے منشور اور ان تحریکات کے زیر اثر نمو پذیر ادب پاروں کے مثبت و منفی اثرات کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے باب میں مخدوم، فیض، مجاز، علی سردار جعفری، اختر الایمان، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، سلام

مچھلی شہری اور حلقۂ ارباب ذوق کے باب میں ن۔م۔ راشد، میراجی، یوسف ظفر، قیوم نظر، مختار صدیقی اور ضیا جالندھری جیسے اہم شعرا کی نظموں کا مطالعہ تہذیبی و ثقافتی سیاق و سباق میں کیا ہے۔ اس باب کے اختتام میں 127 اہم جدید شعرا کی نمائندہ نظموں کی فہرست بھی مرتب کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں کوثر مظہری نے مجموعی طور پر دو اہم زاویۂ نظر کو ملحوظ رکھا ہے۔ اوّلاً میں اہم نظم گو شعرا کی منتخب نظموں کا تہذیبی و ثقافتی تناظر میں مطالعہ جسے ''ثقافتی تنقید'' کا نام دیا جا سکتا ہے اور ثانیاً عہد حاضر میں جدید نظم نگاری کے عہد کا تعین۔ جدید اور قدیم اپنے آپ میں ایک ایسی بحث ہے جو وضاحت طلب ہے تاہم ہر عہد کا قاری اپنے ماضی اور حال کے سرمایے اور اس کی موضوعاتی و ہیئتی صورتوں کے مدنظر ادب پاروں کو قدیم و جدید کے خانوں میں تقسیم کر کے دیکھتا ہے۔ کوثر مظہری نے اپنی اس کتاب میں ''جدید اردو نظم'' کا سرا اگرچہ حالی سے میراجی تک ملایا ہے لیکن کتاب میں تحریر کردہ اپنے موقف میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اردو نظم نگاری کے سفر میں آج جس پیمانے پر تبدیلیاں آگئی ہیں اس لحاظ سے ہمیں جدید اردو نظم کا سرا ''دو متوازی میلانات'' ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق سے ہی جوڑ کر دیکھنا چاہیے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب قارئین کے حلقے میں قبولیت حاصل کرے گی۔

● **محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی۔ حیات و کارنامے**

مصنف: حبیب الرحمٰن نیازی

صفحات: 256، **قیمت**- 200/ روپے

ناشر: مصنف، شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج اجمیر، راجستھان

مبصر: محمد شاہد پٹھان، 22، ٹی آر، راجستھان یونیورسٹی کیمپس، جے پور-4

زیر تبصرہ کتاب میکش اکبرآبادی کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق پہلی منضبط اور جامع کتاب ہے، اس سے قبل چند مضامین، میکش اکبرآبادی سے متعلق دیکھنے کو ملتے ہیں، مگر ان کی نوعیت تحقیقی اور تنقیدی کم ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ صاحب کتاب نے باب اول میں ''اکبرآباد کا تعارفی جائزہ'' کے تحت اکبرآباد کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے اس کی تاریخی، تہذیبی، ادبی اور مذہبی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے۔ مصنف نے اکبرآباد کے ادبا و شعرا کو زمانی ترتیب کے ساتھ چھ ادوار میں منقسم کیا ہے اور جملہ ادوار کے شعرا کے نمایاں محاسن شعری کی نشاندہی بھی کی ہے، جس سے اکبرآباد (آگرہ) کی ادبی و شعری تاریخ کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ آگرے کے متعدد شعرا دہلی اور ملک کے دوسرے حصوں میں سکونت اختیار کرتے رہے، میر و غالب کے زمانے تک آگرے میں متعدد اہل قلم پیدا ہوئے، ان سب کا تذکرہ مصنف نے متذکرہ باب میں کیا ہے۔ مصنف نے باب دوم میں ''میکش اکبرآبادی کی حیات و شخصیت'' کے تحت ان کے خاندانی حالات، نام و نسب، تعلیم و تربیت، ازدواج و اولاد، مذہبی عقیدے، چہرہ، سراپا، معمولات اور اخلاق و عادات کے ساتھ ساتھ باب کے آخری حصے میں تصانیف میکش (شعری و نثری) کا تعارف پیش کیا ہے۔

'میکش کے کلام کا تنقیدی تجزیہ' اس کتاب کا تیسرا باب ہے جس میں مصنف نے اردو غزل اور نظم کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے میکش کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ مقالہ نگار نے اردو غزل کے اہم رجحانات و میلانات کا ذکر کرتے ہوئے میکش کی غزل گوئی سے متعلق لکھا ہے: ''میکش کی غزل میں تصوف کے اثرات بہت گہرے ہیں، اور ان کی شاعری کے ابتدائی دور سے ہی اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ میکش کی غزل گوئی میں وحدت الوجود کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے جسے انھوں نے تغزل کی چاشنی میں پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی، صداقت پسندی اور انقلاب کی آرزو کا بیان بھی متفرق اشعار میں پایا جاتا ہے۔'' غزل کے بعد میکش کی نظمیہ شاعری کے نمایاں موضوعات و میلانات کا جائزہ لیا ہے۔ میکش کی نظم نگاری کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر نیازی لکھتے ہیں: ''ان کی نظموں پر اقبال، جوش اور فراق کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ میکش کی نظموں میں غم عشق بھی ہے، غم روزگار بھی، آزادی کی تڑپ بھی ہے اور وطن کی محبت بھی، انسانیت و دردمندی بھی ہے اور سیاسی و سماجی شعور بھی لیکن ان کی زیادہ تر نظموں کا مرکز جلوۂ حسن کی تابانی ہے۔''

باب چہارم میں میکش کی نثری خدمات کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ میکش اکبرآبادی نے نثر میں بھی بعض تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، ان میں نقد اقبال، مسائل تصوف اور غوث الاعظم، بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دو مختصر رسائل ''نغمہ و اسلام'' اور ''توحید و شرک'' کے علاوہ مختلف موضوعات پر تقریباً پچاس مضامین دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔ باب پنجم میں ''ہم عصران میکش'' کے تحت دلگیر، اخضر اکبرآبادی، نجم آفندی، شوخ اکبرآبادی، سیماب اکبرآبادی، رعنا اکبرآبادی، صبا اکبرآبادی، ل۔ احمد اکبرآبادی، مخمور اکبرآبادی، مولانا مفتی انتظام اللہ شہابی اور مولوی طاہر فاروقی کے کوائف اور ان کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالی ہے۔ آخری باب میں میکش کی شعری اور نثری خدمات کا اجمالاً جائزہ پیش کیا ہے۔ بہ اعتبار مجموعی ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی کی یہ کتاب قارئین کے لیے میکش اکبرآبادی کے تعلق سے خاطر خواہ مواد بہم پہنچاتی ہے۔

● تلاش وتجزیہ
مصنف: محمد نعمان خاں
صفحات: 152، قیمت: -/200 روپے
ناشر: مصنف، 103 تھرڈ فلور، لین نمبر 3، جوہری فارم، (اوکھلا) نئی دہلی۔ 25
ملنے کا پتہ: دبستان بھوپال، زیب ولا، A-79، گنوری، بھوپال، (ایم. پی.)
مبصر: محمد معظم الدین، شعبۂ اردو، این سی ای آر ٹی، آربندو مارگ،
نئی دہلی۔ 110016

''تلاش و تجزیہ'' محمد نعمان خاں کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''بھوپال ادب کے آئینے میں'' 1994 میں شائع ہوا تھا۔ گذشتہ سال ان کی ایک اور کتاب ''بھوپال میں اردو— انضمام کے بعد'' شائع ہو چکی ہے۔ ''تلاش و تجزیہ'' پیش گفتار اور مقدمے کے علاوہ پندرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل یہ جملہ مضامین ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مضمون ''کالی داس اور اردو ادب'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں کالی داس کی عالمی شہرت، ان کے ادبی نظریات اور ان کی تصانیف کا ذکر شامل ہے۔ علاوہ ازیں کالی داس کی شعری اور نثری تصانیف کے اردو ترجموں کے ذریعے اردو ادب پر ان کے اثرات کا ایک سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون ''سرسید احمد خطوط کے آئینے میں'' ہے جس میں سرسید کی مجموعی خدمات، مکتوب نگاری اور اہم مکتوب نگاروں کا ذکر کرنے کے بعد سرسید کی خطوط نگاری کا تفصیل سے جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سرسید کی شخصیت کو سمجھنے اور بجا طور پر ان کی خدمات سے واقفیت کے لیے ان کے خطوط سے زیادہ معتبر اور مستند ذریعہ کوئی اور نہیں ہے۔

کتاب کا تیسرا مضمون ''شبلی نعمانی کا ایک عقیدت مند — مولانا ابوالکلام آزاد'' ہے جس میں دونوں شخصیات کے درمیان بعض امور میں مماثلت تلاش کرنے کے بعد مولانا آزاد کی شبلی کے تئیں عقیدت مندی اور ان کی علمیت وفضیلت کا اعتراف ان کی تحریروں بالخصوص خطوں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ آخر میں اس بات کی طرف بھی واضح اشارہ کیا ہے کہ شبلی بھی مولانا آزاد کی علمیت وفضیلت کے بے حد مداح تھے۔ اگلے پانچ مضامین کا مرکز ومحور علامہ اقبال کی ادبی شخصیت کو بنایا ہے ''اقبال کا نظریۂ فکر وفن'' میں اقبال کی شاعرانہ اور مفکرانہ دونوں حیثیتوں کو لازم وملزوم قرار دیا گیا ہے نیز اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ اقبال نے شعری تقاضوں اور فنی نزاکتوں کو، جن کی وجہ سے ان کا بیشتر کلام شعری جمالیات سے مزین ہے، کس قدر اہمیت دی ہے۔ ''علامہ اقبال اور بھرتری ہری'' اس مجموعے کا بہت اہم اور دل چسپ مضمون ہے۔ مضمون نگار نے بھرتری ہری کے راجا سے جوگی بننے کی داستان اور اس کی تصانیف پر اظہار خیال کرنے کے بعد بھرتری ہری کے ان ذہنی رویّوں کی بالخصوص وضاحت کی ہے جن سے اقبال نے استفادہ کیا ہے اور اقبال کے ایسے کلام کو پیش کیا ہے جس پر بھرتری ہری کے اثرات نمایاں ہیں۔ ''مولانا سید ابوالحسن ندوی نقوش اقبال کی روشنی میں'' مضمون نگار نے سید ابوالحسن ندوی کی جملہ حیثیات، ان کے علمی اکتسابات اور ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کا مختصراً ذکر کرنے کے بعد ان کی اہم تصنیف ''نقوش اقبال'' کی روشنی میں ان کی عالمانہ اور فاضلانہ حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔ دونوں کے مابین ذہنی مماثلتوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ''تعمیر انسانیت میں علامہ اقبال کا حصہ'' کے تحت مضمون نگار نے قرآن حکیم، اقبال کی تصانیف اور ان کے فلسفے کی روشنی میں انسان کامل اور انسانیت کے اجزائے ترکیبی سے متعلق اقبال کے نظریات کو پیش کیا ہے۔

''آبروئے تحقیق وتدوین— مولانا امتیاز علی عرشی'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں مولانا عرشی کے جملہ کارناموں کا ذکر کرنے کے بعد بہ حیثیت محقق و مدون ان کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالی ہے۔ ''موجد گلابی اردو— ملا رموزی'' اس کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے۔ اس میں ملا رموزی کی شخصیت، گلابی اردو کی ابتدا اور غرض و غایت کے علاوہ نمایاں اوصاف پر روشنی ڈالی ہے ساتھ ہی ملا رموزی کی شعری اور نثری تصانیف کی روشنی میں ان کی ادبی حیثیت کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ''لذت آشنائی— ایک مطالعہ'' کے تحت مضمون نگار نے زاہدہ زیدی کی اس تنقیدی کتاب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ''اردو اخبارات میں زبان کا معیار ومزاج'' کے تحت مضمون نگار نے اردو زبان وادب کو مقبول عام بنانے میں اردو اخبارات کی خدمات کو سراہا ہے۔ قدیم وجدید اخبارات میں مروج زبانوں پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ان اسباب کو پیش کیا ہے جن کی وجہ سے آج اردو اخبارات کی زبان کا معیار و مزاج متاثر ہو رہا ہے۔

''مدھیہ پردیش میں اردو تعلیم کی صورت حال'' آخری مضمون ہے جس میں بالخصوص شمالی ہند میں اردو تعلیم کی مایوس کن صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ مدھیہ پردیش میں بھی اردو تعلیم کی صورت حال شمالی ہند کی دیگر ریاستوں کی طرح ہی مایوس کن ہے۔ اس صورت حال کے پس پشت کارفرما اسباب کی نشان دہی بھی کی ہے ساتھ ہی اس کے تدارک کے لیے حکومت مدھیہ پردیش کی جانب سے کی جانے والی مختلف کوششوں اور اردو دوست حضرات کی ذمہ داریوں کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ یوں تو اس کتاب کے جملہ مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چند مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔ امید ہے کہ ڈاکٹر محمد نعمان خاں کی اس کاوش کی علمی وادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

• دفتری طریق کار
مصنف: منیر انجم
صفحات: 144، قیمت: -/75 روپے
ناشر: مصنف، 1681، گلی تخت والی، سوئیوالان، دریا گنج، نئی دہلی-110002
مبصر: رئیس احمد، 1/1007، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110022

زیر تبصرہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے بطور خاص دفتری انتظامیہ کے جملہ امور سے متعلق نہایت کارآمد اور مفید مطلب ہے۔ صاحب کتاب نے دفتری طریق کار کے مراحل و منازل کو نہ صرف سادہ اور سلیس زبان میں پیش کیا ہے بلکہ دفتری امور کی مختلف انواع و اقسام کی وضاحت بھی دلکش اور دلنشیں پیرایے میں کی ہے۔ دفتری امور کو اردو زبان میں انجام دینے کے خواہش مند ہر سطح کے کارکنان کے لیے یہ کتاب ایک بیش قیمت تحفے اور رہنما کا درجہ رکھتی ہے۔

منیر انجم نے دفتری طریق کار کے جن اہم مراحل و منازل کو موضوع گفتگو بنایا ہے ان میں 'دفتر: تعریف اور طریق کار'، 'نوٹنگ کی اقسام'، 'نوٹ بنانے کے لیے ضروری ہدایتیں'، 'نوٹ کے اجزائے ترکیبی'، 'نوٹس کے نمونے'، 'سرکاری خط و کتابت کی خصوصیات و اقسام'، 'خطوط کے نمونے'، 'مسودہ نگاری' (ڈرافٹنگ) 'ڈرافٹ بنانے کے لیے چند اہم ہدایتیں'، 'مسل داری' (فائلنگ) 'دفتری کارکن'، 'سرکاری خط و کتابت کے نمونے' اور 'فرہنگ اصطلاحات انتظامیہ' شامل ہیں۔

'دفتر: تعریف اور طریق کار' زیر تبصرہ کتاب کا ایک اہم حصہ ہے جس میں دفتر اور دفتری انتظامیہ کے تعارف کے علاوہ دفتر کے جملہ امور اور قانونی اصول و ضوابط پر روشنی ڈالی ہے، جن میں ڈاک کی دصولیابی سے لے کر مختصر کیفیت نگاری اور مسودہ نگاری کے موضوع پر مع امثال گفتگو شامل ہے۔ 'نوٹنگ کی اقسام اور نوعیت' کے مطالعے سے دفتری طریق کار کے تعلق سے نوٹنگ کی اہمیت واضح ہوتی ہے مزید برآں صاحب کتاب نے نوٹنگ سے متعلق اختصار کے ساتھ چند اہم رہنما اصولوں کی جانب بھی واضح اشارات کیے ہیں جو ہر سطح کے دفتری کارکنان کے لیے دفتری امور کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے تناظر میں اہمیت کے حامل ہیں۔ 'نوٹ کے اجزائے ترکیبی' کے تحت سرنامہ، حوالہ نمبر و تاریخ، موضوع اور نفس مضمون، کے علاوہ Inital سے متعلق دفتری کارکنان کے لیے مع امثال ضروری معلومات بہم پہنچائی ہے۔

'سرکاری خط و کتابت کی خصوصیات و اقسام' کے زیر عنوان صاحب کتاب نے سرکاری و نیم سرکاری خط و کتابت کی امتیازی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے سرکاری خطوط کی مختلف اقسام کو مثالوں کے ساتھ واضح کیا ہے، جن میں خط، نیم سرکاری خط، دفتری یادداشت، غیر رسمی نوٹ/کیفیت، تار، مجلتی خط دفتری حکم نامہ، حکم نامہ، اعلان، قرارداد اور پریس کمیونک/نوٹ کے ساتھ ساتھ 'توثیق/تطہیر' کرنا شامل ہیں۔

'مسودہ نگاری' کے زیر عنوان دفتری کارکنان کے لیے ڈرافٹنگ کے تعلق سے چند اہم ہدایات درج کی ہیں جن کی روشنی میں بہتر ڈرافٹ تیار کیا جا سکتا ہے۔ فائلنگ (مسل داری) بھی دفتری طریق کار کا ایک اہم جزو ہے، مصنف نے مسل داری کے جملہ مراحل پر بتفصیل روشنی ڈالی ہے۔ منیر انجم نے کتاب کے آخر میں 'فرہنگ اصطلاحات انتظامیہ' کے تحت دفتری امور میں بکثرت استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے اردو متبادل اور اردو اصطلاحات کی ایک مختصر مگر جامع فرہنگ مرتب کی ہے۔ اس فرہنگ کی ترتیب میں مصنف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی تیار کردہ فرہنگ اصطلاحات (انتظامیہ) سے بھی مدد لی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ اردو زبان میں کام کرنے والے جملہ دفتری کارکنان کے لیے مدد معاون ہے۔

کتاب کی خوبصورت اور معیاری اشاعت پر مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ''دفتری طریق کار'' کے دوسرے ایڈیشن کی جلد ہی نوبت آئے گی۔

• اعتراف (کتابی سلسلہ-1)
صفحات: 448، قیمت: -/200 روپے (غیر مجلد) -/300 روپے مجلد
مرتبین: ڈاکٹر رام پنڈت، اسلم پرویز، وقار قادری
ناشر: ڈاکٹر رام پنڈت، الک نندہ، 14/459، نہرو نگر، کرلا (ایسٹ) ممبئی-70
مبصر: مخمور سعیدی، بے 3، کرشنا کنج، ایکسٹنشن لکشمی نگر، دہلی-92

''اعتراف'' کتابی سلسلے کی یہ پہلی کتاب ندا فاضلی کی شخصیت، شاعری اور نثر نگاری کے تعارف و تحسین پر مشتمل ہے۔ آخر میں ندا کا منتخب کلام (انتخاب عبدالاحد ساز نے کیا ہے) اور ان کی پہلی نثری کتاب ''ملاقاتیں'' سے کچھ انٹرویو بھی شامل کیے گئے ہیں۔ خود ندا سے بھی تین انٹرویو ہیں جو بالترتیب عبدالاحد ساز، فرحان حنیف اور وقار قادری نے کیے ہیں۔ یہ انٹرویو زندگی اور فن کے بارے میں ندا کے نقطۂ نظر کو وضاحت سے سامنے لاتے ہیں۔ ندا کی کتابوں پر تبصروں کو بھی ''اعتراف'' میں جگہ دی گئی ہے۔ تبصرے ان کی نثری کتابوں ''دیواروں کے بیچ''، ''دیواروں سے باہر'' اور ''چہرے'' پر ہیں اور ایک ان کے شعری مجموعے ''کھویا ہوا سا کچھ'' پر۔ آخر الذکر تبصرہ یوسف ناظم کا ہے اور اول الذکر تبصرے بالترتیب قیصر تمکین، زبیر رضوی، رتن سنگھ، عتیق اللہ، نامی انصاری، سلام بن رزاق، علی احمد فاطمی، مشتاق مومن اور اقبال رضوی کے قلم سے ہیں۔

ندا کی شاعری پر تفصیلی اظہار خیال کرنے والوں میں وارث علوی، بشر نواز، انور خاں، پروفیسر ظہیر علی، رفیعہ شبنم عابدی، انور ظہیر خاں، مقدر حمید، میم ناگ، کنھیا لال نندن اور پریمی رومانی ہیں۔ ان کی نثر نگاری پر شمیم حنفی اور قاسم امام نے گفتگو کی ہے۔ سلطان سبحانی، حامد اقبال صدیقی، پورن پنچ اور وقار قادری کے مضامین شخصی نوعیت کے ہیں جو ندا کے ورود ممبئی اور اس کے بعد کے بعض حالات اور واقعات کو سامنے لاتے ہیں اور ندا کی شخصیت کے بعض دلچسپ پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔

ندا فاضلی ان شاعروں کے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جو 1960 کے آس پاس سامنے آئے اور جلد ہی اپنی ایک پہچان بنالی۔ ندا نثر نگاری کی طرف بعد میں آئے اور یہاں بھی انھوں نے اپنی منفرد شناخت قائم کی لیکن ان کی نثر میں بھی ان کے شاعرانہ ذہن کی کارفرمائی صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ نگاہ کی وہی جز رسی، حواس کی وہی بیداری، گرد و پیش سے وہی باخبری اور پھیلاؤ میں ارتکاز کی وہی کیفیت، نیز لفظوں کے ساتھ وہی تخلیقی برتاؤ جو ان کی شاعری کا خاصہ ہے، ان کی نثر کو بھی امتیاز بخشتا ہے۔

ندا فاضلی کا پہلا مجموعۂ کلام ''لفظوں کا پل'' تھا جو پہلی بار 1971 میں چھپا تھا۔ اس پر ماہنامہ ''تحریک'' دہلی میں تبصرہ کرتے ہوئے میں نے موضوع پر ان کی مضبوط گرفت اور ان کے اسلوب کی انفرادیت کی داد دی تھی مگر یہ بھی کہا تھا کہ ان کی نظر ابھی کچھ خاص منظروں میں قید ہے۔ اس کے بعد ندا کے تین اور مجموعے شائع ہوئے ہیں: ''مور ناچ'' (1978) ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' (1984) ''کھویا ہوا سا کچھ'' (1996) اور ''شہر تو میرے ساتھ چل'' (2004) ''لفظوں کا پل'' ایک نوجوان شاعر کے مشاہدات اور محسوسات کا اظہار ہے۔ ایسے نوجوان کے مشاہدات اور محسوسات جسے زندگی کے صنفی اور جنسی مظاہر سے زیادہ شغف ہے اور یہی مسحور کن مظاہر اس کے فکر و فن کا محور ہیں۔ بعد کے مجموعوں میں ندا اس حصار کو بتدریج توڑتے گئے ہیں اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں تک بھی ان کی نظر رسا ہوئی ہے جو ان کے مشاہدے سے گزر کر ان کے محسوسات کا حصہ بن گئے ہیں۔ ایک بے حس معاشرے میں زندگی کرنے والے حساس انسان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ندا کے اس شعر سے کیجیے:

وہ راہ میں ملا تھا، میں بچ کر گزر گیا
اس کی پھٹی قمیص مرے ساتھ ہو گئی

اس تجربے سے شاعر گوالیار میں رہ کر نہیں گزر سکتا تھا جہاں ندا کی شاعری کا آغاز ہوا اور جہاں کا آدمی اتنی سفاکیوں اور چالاکیوں سے بہرہ ور نہیں تھا۔ بڑے شہروں کی پرتپاک خودغرضیوں اور پرفریب رشتوں سے ندا کا سابقہ تب پڑا جب وہ ممبئی جیسے کاسموپولیٹن شہر کے باسی بنے۔ اس شہر نے ان کی پذیرائی بھی کی مگر خاصی تاخیر سے۔ اس کا احساس خود انھیں بھی ہے اور اس احساس کا بہت خوبصورت اظہار ہوا ہے ان کی اس غزل میں جس کا مطلع ہے:

کہیں چھت تھی، دیوار و در تھے کہیں، ملا مجھ کو گھر کا پتا دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے، مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

زندگی کی اس 'دیر بخشی' کا مثبت اثر یہ ہوا کہ ندا گزرتے ہوئے وقت کے مزاج آشنا ہو گئے اور یہ آشنائی اب عرفان کی حدوں کو چھونے لگی ہے۔

ندا فاضلی روحانیت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی شاعری آدمی کے مادی وجود کے ارد گرد ہی گھومتی ہے۔ مادی وجود کے ممکنات اور ممنوعات کی بڑی شفاف تصویریں ندا کے کلام میں نظر آتی ہیں لیکن انجانے ہی میں سہی دھیرے دھیرے اب ان کے قدم اس طرف بھی بڑھنے لگے ہیں جہاں مادیت اور روحانیت کے درمیانی فاصلے کم ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت ان کے دوہوں میں زیادہ نظر آتی ہے:

سیتا، راون، رام کا، کریں وبھاجن لوگ
ایک ہی تن میں دیکھیے من، تینوں کا سنجوگ

ندا فاضلی ایک صاحب اسلوب شاعر اور نثر نگار ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا ان کی نثر بھی ان کے شاعرانہ مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ ان کے شعری اسلوب پر ان کے پیشرو شاعروں میں میر اور نظیر کے اثرات کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ ہندی اور اودھی کے کچھ شاعروں سے بھی متاثر ہیں۔ کبیر سے متاثر ہونے کا خود انھوں نے اعتراف کیا ہے اور شاید دوہے لکھنے کی طرف وہ کبیر کی انگلی پکڑ کر ہی آئے ہیں، یہ اور بات ہے کہ کبیر کے دوہے ان کے دور کو آئینہ دکھاتے ہیں اور ندا کے دوہوں میں اس دور کی عکاسی ہوئی ہے، جس میں آپ اور ہم سانس لے رہے ہیں۔ ندا بول چال کی زبان کو شعری زبان بنا دینے کا ہنر جانتے ہیں اور یہ ہنر انھوں نے غالباً اپنے انھی پیش رووں سے سیکھا ہے۔

''اعتراف'' کتابی سلسلے کی یہ پہلی کڑی ندا فاضلی کی شخصیت، ان کی شاعری اور ان کی نثر نگاری کا بھرپور تعارف کرا دیتی ہے۔ پیشکش کا انداز مرتبین کی خوش ذوقی پر دلالت کرتا ہے۔

ناشر کے علاوہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی، دہلی، علی گڑھ، کتاب دار جلال منزل، ٹیکر اسٹریٹ، نزد جے۔جے۔ اسپتال ممبئی، معیار پبلیکیشنز۔ کے 302، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی 31، سیفی بک ایجنسی، امین بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

□□□

میخائل زوشینکو (بچوں کا گوشہ)

پولیا

پولیا ایک ناخواندہ عورت تھی۔ وہ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتی تھی۔ اس کا شوہر ایوان نکولا ئیوچ کُچکِن (Kuch-Kin) ایک ذمہ دار سرکاری افسر تھا۔ کسی زمانے میں وہ ایک سیدھا سادہ کسان ہوا کرتا تھا لیکن شہر میں پانچ سال کے قیام نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اسے اس بات کا بے حد احساس تھا کہ اس کی بیوی ناخواندہ ہے۔ وہ اکثر اپنی بیوی سے کہتا:

''پولیا تمھیں چاہیے کہ کم سے کم اپنا نام لکھنا سیکھ لو۔ میرے نام کے آخری دو الفاظ کُچکِن بہت آسان ہیں، لیکن تم یہ بھی نہیں لکھ سکتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لکھنا پڑھنا سیکھ لو۔''

پولیا اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دیتی۔ وہ جواب دیتی'' ایوان اب میرے سیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں بوڑھی ہو رہی ہوں۔ میری انگلیاں سخت ہوتی جا رہی ہیں۔ اب میں لکھنا پڑھنا سیکھ کر کیا کروں گی۔ اب بچوں کے لکھنے پڑھنے کی عمر ہے۔''

پولیا کا شوہر بہت مصروف آدمی تھا۔ بیوی سے بحث کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس لیے وہ خاموش ہو جاتا تھا۔ ایک دن ایوان نکولا ئیوچ کُچکِن ایک چھوٹی سی کتاب گھر لایا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا'' پولیا، یہ ایک خود آموزشی کتاب ہے جو نئے انداز سے لکھی گئی ہے۔ میں تمھیں بتاؤں گا کہ اس سے تم کیسے پڑھنا لکھنا سیکھ سکتی ہو۔''

پولیا زیرِ لب مسکرائی، کتاب اپنے ہاتھ میں لی، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور برتنوں کی الماری میں چھپا دیا۔ جیسے کہہ رہی ہو:'' اسے یہیں رہنے دو۔ شاید ہمارے پوتے پوتیاں اس سے کچھ فائدہ اٹھا سکیں۔''

ایک دن پولیا اپنے شوہر کے جیکٹ کو سینے کے لیے بیٹھی جس کی آستین پھٹ گئی تھی۔ اس نے سوئی ہاتھ میں لی اور جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا تو کاغذ کے سرسرانے کی آواز سنی۔ پولیا نے سوچا شاید جیکٹ کی جیب میں رقم ہے۔ اس نے جب دیکھا تو کاغذ میں ایک خط تھا۔ خوشخط تحریر میں لکھے گئے اس خط سے پرفیوم کی خوشبو آ رہی تھی۔ پولیا کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے سوچا، کیا ایوان کو کسی دوسری عورت سے پیار ہو گیا ہے۔ کیا وہ کسی تعلیم یافتہ خاتون سے محبت بھرے لہجے میں سلسلۂ مراسلت قائم کر رہا ہے اور اپنی جاہل بیوی کا مذاق اڑا رہا ہے۔ پولیا اس خط کو کیسے پڑھ سکتی تھی۔ پولیا کو زندگی میں پہلی بار شرمندگی کا احساس ہوا کہ اس نے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ اس نے سوچا، اگرچہ یہ کسی اور کا خط ہے لیکن مجھے جاننا ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ شاید ایوان کسی دوسری عورت سے پیار کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے مجھے گاؤں واپس جانا پڑے اور پھر سے ایک کسان عورت کی زندگی گزارنی پڑے۔

پولیا نے رونا شروع کر دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ آخر ایوان میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔ وہ اپنی مونچھوں اور کپڑوں کا زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔

پولیا بار بار خط کو دیکھتی اور روتی رہتی۔

پولیا نے خط کو نعمت خانے میں چھپا دیا، جیکٹ کی سلائی کی اور ایوان کے گھر واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔ جب ایوان گھر آیا تو پولیا نے اسے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا اور اپنے شوہر سے کہا کہ وہ لکھنا اور پڑھنا سیکھنا چاہتی ہے، وہ اپنی جہالت سے عاجز آ گئی ہے۔

ایوان نکولا ئیوچ کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے کہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں تمھیں پڑھنا اور لکھنا سکھاؤں گا۔"

"بہت بہتر" پولیا نے کہا۔

دو مہینے تک پولیا پابندی سے پڑھتی رہی اور حرفوں کو جوڑنا، الفاظ بنانا اور جملے یاد کرنے کے علاوہ ہر شام وہ اس خط کو نعمت خانے سے نکال کر اس میں چھپے راز کو جاننے کی کوشش کرتی رہی لیکن پولیا کے لیے یہ کام بے حد مشکل تھا۔

تیسرے مہینے میں پولیا نے پڑھنا سیکھ لیا۔ ایک دن ایوان نکولا ئیوچ کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ پولیا نے نعمت خانے سے خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ اس کے لیے وہ تحریر سمجھنا مشکل تھا لیکن کاغذ سے آنے والی خوشبو نے اسے پڑھنے کی کوشش جاری رکھنے پر مجبور کیا۔ خط اس کے شوہر کے نام تھا۔

"پیارے کامریڈ!

میں نے تم سے جس کتاب کا وعدہ کیا تھا، وہ ارسال کر رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمھاری بیوی دو یا تین مہینے میں پڑھنا لکھنا سیکھ لے گی۔ بوڑھے لڑکے، تم مجھ سے وعدہ کرو کہ اس کو پڑھنا سکھاؤ گے۔ اسے سمجھاؤ اور احساس کراؤ کہ ایک جاہل عورت ہونا کتنی بری بات ہے۔

روسی انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر ہم لوگ پورے سوویت جمہوریہ میں لوگوں کو پڑھا رہے ہیں لیکن کسی وجہ سے ہم لوگ اپنے قریبی لوگوں کو بھول گئے ہیں۔ ایوان نکولا ئیوچ، تم مجھے یقین دہانی کراؤ کہ تم اس ذمے داری کو نہیں بھولو گے۔

پولیا نے دوبارہ پورا خط پڑھا اور بے اختیار رونے لگی۔

(روسی کہانی)

☐☐☐

انگریزی سے ترجمہ: فیروز عالم

پتہ:
Depatt. of Distance Education
MANUU, Gachi Bawli
Hyderabad-32
(A.P)

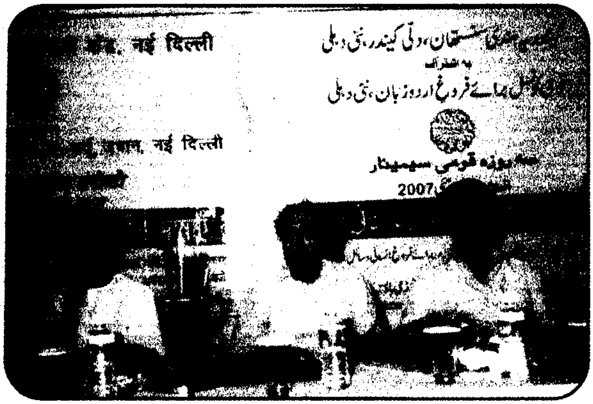

دوسرے اجلاس کے شرکا (دائیں سے) پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شمیم حنفی اور جناب وجے بہادر۔

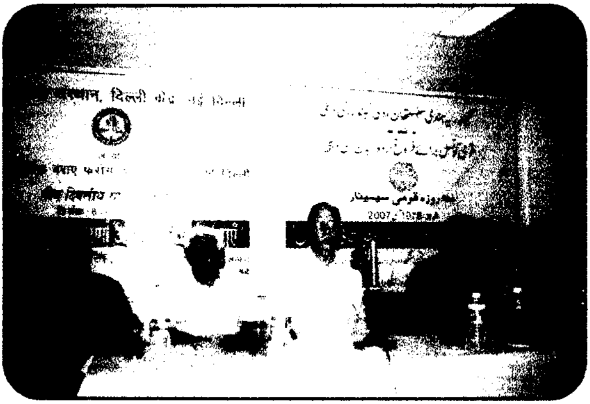

10 مئی کے پہلے اجلاس کے شرکا (دائیں سے) جناب ارجن دیو چارن، جناب پروفیسر پرشوتم اگروال، جناب غلام نبی خیال، جناب کشمیری لال ذاکر اور جناب راجا رام بھادو۔

سیمینار ہال کا ایک منظر: پہلی صف میں (دائیں سے) محترمہ رشمی چودھری، ڈائرکٹر آف لینگویجز، وزارت فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند، پروفیسر شمیم حنفی اور ڈاکٹر علی جاوید ڈائرکٹر قومی اردو کونسل۔ پروگرام میں شریک دیگر خواتین و حضرات کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

Date of Publication : 24/05/2007

URDU DUNIYA Monthly, June 2007, Vol. 9, Issue: 6
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالامال بنانے کی ایک تحریک

خودبھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے فی شمارہ 25 روپے

زرسالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

[illegible] خریدار صرف ڈرا[illegible]

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	[illegible]	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 [illegible]	[illegible]
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	[illegible]36	[illegible]

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک:8، ونگ:7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and
printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at
NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938